Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1967

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان

اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی

قیمت کب ادا کرتے ہیں۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

They Shall Never Die

". . . . . Who can defeat a nation which knows to play hide and seek with death ? I may not remember the Indo- Pakistan war but I will never forget the smile full of nerve the conducting army officer gave me. This smile told me how fearless and brave are the Pakistani young men. Playing with fire to these men—from the Jawan to the General Officer Commanding, was like children playing with marbles in the streets. . . . . .

". . . . . I asked the G.O.C., how is it that despite small number you are overpowering the Indians? He looked at me, smiled and said: 'If courage, bravery and patriotism were purchasable commodities, then India could have got them along with American aid'. . . ."

LOUIS KARRAR, "*The Time Magazine*"
(*September 22, 1965*)

"اس قوم کو کون شکست دے سکتا ہے جو موت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو ؟ میں بھارت ۔ پاکستان جنگ کو یاد رکھ سکوں یا نہ رکھ سکوں ۔ لیکن میں پاکستانی فوج کے ایک نوجوان افسر کے اس تبسم جرأت نواز کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا (جس سے اس نے میرا استقبال کیا تھا) ۔ اس تبسم نے مجھ پر واضح کر دیا کہ پاکستان کے نوجوان کس قدر بہادر اور نڈر ہیں ۔ یہ لوگ ــــ عام سپاہیوں سے لے کر جنرل آفیسر کمانڈنگ تک ــــ آگ کے گولوں سے یوں کھیلتے تھے جیسے بچے گلیوں میں بنٹوں سے کھیلتے ہیں . . . .

میں نے جنرل آفیسر کمانڈنگ سے پوچھا کہ اس کا بالآخر راز کیا ہے کہ آپ اس قدر قلیل التعداد ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کو یوں مغلوب کئے جا رہے ہیں ؟ اس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا ، مسکرایا ، اور کہا کہ

اگر حوصلہ ، جرأت اور جذبۂ حب الوطنی ایسی اجناس ہوتیں جو بازار سے خریدی جا سکتیں تو ہندوستان انہیں امریکی امداد کے ساتھ حاصل کر لیتے ۔"

(یہ متاع گراں بہا بازار میں بکتی نہیں ۔ یہ سپاہی کے خون جگر میں پنہاں ہوتی ہے ۔ طلوع اسلام)

لوئس کرار ۔ نمائندہ ٹائم میگزین (امریکہ)

۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ	بدل اشتراک
۸۰۸۰۰	پاکستان - ایک روپیہ	پاکستان: سالانہ ـــــ دس روپے
خط وکتابت: ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ، لاہور	ہندوستان - ڈیڑھ روپیہ	ہندوستان: سالانہ ـــــ پندرہ روپے
		غیر ممالک: سالانہ ـــــ ایک پونڈ

جلد (۲۰) | ستمبر ۱۹۶۷ء | نمبر (۹)

فہرست

۱. یاد ہیں ـــــ ۲
۲. ہندوؤں کی سیاست کے اصول ـــــ ۳
۳. لمعات ـــــ ۴
۴. اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں ـــــ (محترم عنایت اللہ صاحب) ـــــ ۲۰
۵. رابطہ باہمی ـــــ ۳۰
۶. جہاد ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۴۳
۷. ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے ـــــ ۴۹
۸. طلوع اسلام کا مسلک و مقصد ـــــ ۶۱
۹. بیاتا گل بیفشانیم ـــــ ۶۲
۱۰. افریقہ، ایشیا کا عالمی کردار ـــــ (محترم خورشید عالم صاحب) ـــــ ۶۹-۷۴

ایڈیٹر محمد طفیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ، لاہور

یاد میں

(۱) پاکستان کی سرحدوں پر بسنے والے ان بے گناہ، مظلوم، انسانوں کی، جنہیں بھارتی درندوں نے ۶ستمبر ۶۵ء کی صبح بغیر کسی قسم کی آگہی یا اعلانِ جنگ کے، اُس وقت اپنی ہوسِ خون آشامی کا شکار بنالیا جب وہ آرام سے اپنے گھروں میں سو رہے تھے، اور ستاروں کی آنکھوں کے علاوہ، اس خونی منظر کا دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

(۲) ان معصوم بچوں کی، جنہیں مرہٹہ "بلوانوں" اور "سکھ" "سورماؤں" نے اُچھال اُچھال کر اپنی سنگینوں کی نوکوں سے چھلنی کر دیا، اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم کیوں لیا تھا۔

(۳) اُن عزت مآب دخترانِ ملت کی، جنہیں یہ انسان نما بھیڑیئے، ان کے صحنِ خانہ سے اُن نامعلوم ویرانوں کی طرف کشاں کشاں لے گئے، جہاں سے پھر اُن کی آہ و فغاں تک کسی کو سنائی نہ دی۔

(۴) اور — یاد میں،

اُن غیور وجسور جوانانِ ملت کی جوان بے پناہ مظالم کا بدلہ لینے کے لئے، شمشیر بکف اور کفن بدوش میدانِ کارزار میں آنکلے۔ اور اپنی عدیم النظیر جرأت و بسالت سے دنیا کو دکھا دیا کہ حق کی خاطر جان دینے والے کیا کچھ کر دکھایا کرتے ہیں۔

اور — چھمب، جوڑیاں، سیالکوٹ، چونڈہ، واہگہ، برکی، ہڈیارہ، سلیمانکی، راجستھان کے میدانوں کے ان ذرات کی جو اپنی عالمتاب چمک دمک سے اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ خونِ شہدا کی رنگینی کس طرح حنا بندِ عروسِ ملت ہوتی ہے۔

لاکھوں سلام و صلوٰت ہوں اُن شہدائے اُمت اور مجاہدینِ ملت پر، جنہوں نے اپنی فقید المثال قربانیوں سے اس خطۂ زمین کو دشمن کی دستبرد سے محفوظ رکھا۔ جسے اسلام کی تجربہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ ؎

بر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

ہندوؤں کے اُصولِ سیاست

ہندوؤں کی تاریخ میں ایک ہی سیاسی فلاسفر کا نام ملتا ہے۔ یعنی چانکیہ۔ اس کا لقب کوٹلیہ تھا جس کے معنی مکار اور فریب دہ ہیں۔ اس فلاسفر نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی ہے جسے ارتھ شاستر کہا جاتا ہے یہ شاستر ہندو لیڈروں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں سیاست کے جو چند اصول بطور ضابطہ ہدایت دیئے گئے ہیں، وہ قابلِ غور ہیں۔

پہلا اصول ۔ حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

دوسرا اصول۔ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ تمام ہمسایوں پر اپنی نگرانی قائم رکھی جائے۔

تیسرا اصول۔ غیر ہمسایہ حکومتوں سے دوستانہ تعلقات استوار رکھے جائیں۔

چوتھا اصول ۔ جن سے دوستی رکھی جائے ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیشِ نظر رہے۔ اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

پانچواں اصول۔ طے میں رقابت کی آگ ہر وقت مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانے سے جنگ جاری رکھی جائے اور اس جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔

چھٹا اصول ۔ مخالفانہ پروپیگنڈہ، تخریبی کارروائیاں، ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم، دوسرے ملکوں میں اپنے آدمی ناجائز طریق سے داخل کر کے فتنہ کالم کی طرح یہ سب کچھ مسلسل کیا جائے۔

ساتواں اصول ۔ رشوت اور دوسرے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے۔ دوسرے ملک کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول ۔ امن کے قیام کا خیال بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔

یہ ہیں وہ سیاسی "اصول" اس قوم کے جس کے ساتھ (بدقسمتی سے) ہمیں بطور ہمسایہ واسطہ پڑا ہوا ہے۔

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نہ گفت ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

حیات جاوداں اندر ستیز است

بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ کسی مسئلہ کو قوت کے استعمال کے بجائے دلائل و براہین سے سلجھانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں آسان ہو سکتا ہے جب فریق مقابل عقل و فکر سے کام لینے پر آمادہ ہو۔ اگر وہ ضد و تعصب کو چھوڑے ہی نہیں تو دلائل و براہین سب بیکار رہ جاتی ہیں۔ تحریک پاکستان کی کشمکش کے سلسلہ میں ہمارے ساتھ یہی ہوا۔ ہمارا مطالبہ یکسر حق و انصاف پر مبنی اور دلائل و براہین کی رُو سے پیش کردہ تھا۔ بات بالکل واضح تھی۔ انگریز ہندوستان سے جا رہا تھا۔ سوال زیرِ غور یہ تھا کہ اس کے بعد ہندوستان کی سیاست کا نقشہ کیا ہوگا۔ ہندو نے بنایت سادگی (لیکن انتہائی پُرکاری) سے کہہ دیا کہ یہ کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ ہی نہیں۔ اس وقت دنیا میں جمہوری نظام کو بہترین اندازِ حکومت سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان ایک ملک اور اس کے تمام باشندے ایک قوم ہیں۔ لہٰذا، اس ملک میں جمہوری انداز کی حکومت قائم کر لی جائے گی۔ بادی النظر میں ہندوؤں کا یہ مؤقف نہایت معقول دکھائی دیتا تھا۔ لیکن درحقیقت اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ابدالآباد تک ہندوؤں کی غلامی میں رکھا جائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی ایک چوتھائی تھی۔ اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کسی وقت ان کی آبادی اتنی بڑھ جائے کہ وہ تعداد میں ہندوؤں سے زیادہ ہو جائیں اور اس طرح اپنی حکومت قائم کر سکیں۔

لیکن مسلمانوں کے لئے یہ مسئلہ خالص سیاسی نہیں بلکہ دینی تھا۔ قرآن کریم کی رُو سے، قومیت کا معیار اشتراکِ وطن و نسل نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کا اشتراک ہے۔ بنابریں محض ایک ملک کے باشندے ہونے کی بنا پر مسلمان اور ہندو ایک قوم بن نہیں سکتے تھے۔ مسلمان ایک مستقل جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قوم کا اپنا ضابطۂ قوانین (قرآن کریم) ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے وہ حقیقی معنوں میں اسلامی زندگی بسر کرنے کے

مدعی ہو سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اپنے ضابطۂ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اپنی آزاد مملکت کی موجودگی لاینفک ہے۔

یہ تھے وہ دلائل جن کی بنا پر پاکستان کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ لیکن وہاں دلائل سننے کے لئے کوئی آمادہ ہی نہیں تھا۔ انگریز کو مسلمانوں کی جداگانہ مملکت میں "پان اسلام ازم" کا ہوا دکھائی دیتا تھا اس لئے وہ اس کی سخت مخالفت کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب تقسیم ہند کا مسئلہ طے ہو گیا اور اس سے متعلق بل برطانوی پارلیمان میں رسمی منظوری کے لئے پیش ہوا تو برطانیہ کے وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے (جو اس وقت میجر ایٹلی تھے) اپنی تقریر میں کہا کہ

> ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے اُمید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں، ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۱۲/۷/۵۱)

اُدھر انگریز یہ کہہ رہا تھا اور اِدھر ہندو (تقسیم ہند کے فیصلے کو تسلیم کر لینے کے بعد) چلا رہا تھا کہ:

> ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا، خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں۔

(ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی۔ بحوالہ آرگنائزر، دہلی۔ مورخہ ۲/۷/۴۸)

دیوان چمن لال جیسے بظاہر اعتدال پسند ہندو نے اُس اخبار کی اُسی اشاعت میں کہا تھا کہ

> میں نا اُمید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم ..... انہیں امن اور شانتی کی لوریاں دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوتے ہیں۔

انگریز اور ہندو کی طرف سے پاکستان کی مخالفت قابل فہم تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر آسمان کی آنکھ سے آنسو ٹپک رہے تھے کہ خود مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی اس مخالفت میں ہندو کا ہمنوا بلکہ ان سے بھی ایک قدم آگے تھا ـــ اور قیامت بالائے قیامت ـــ کہ یہ طبقہ (جیسے) حضرات علماء کرام پر مشتمل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی

جس قدر تباہی اس طبقہ کے ہاتھوں ہوئی ہے، کسی خارجی قوت کے ہاتھوں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوا — اس طبقہ نے کس کس انداز سے تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی، اس کے متعلق ہم نے اس تحریک کے دوران بھی شرح وبسط سے لکھا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی مسلسل لکھتے چلے آرہے ہیں۔ (اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس طبقہ کی طرف سے کافر اور بے دین ٹھہرائے جا رہے ہیں)۔ صحبتِ امروزہ میں، ہم اس سلسلہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھنا چاہتے، بلکہ ایک ایسی اتھارٹی پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے بڑھ کر ہمارے ملک میں اس وقت کوئی دوسری اتھارٹی نہیں ہو سکتی۔ ہمارا مطلب صدر پاکستان، محمد ایوب خان سے ہے۔ ان کی خود نوشت سوانح حیات (FRIENDS NOT MASTERS) کے عنوان سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ وہ اس میں (تحریکِ پاکستان کی کشمکش کے سلسلہ میں) لکھتے ہیں[1]:

"اس برصغیر میں علماء کی تاریخ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ لوگ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہے ہیں۔ یہ تصادم، تحریکِ پاکستان کے دوران انتہائی شدت اختیار کر گیا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، علماء کی ایک کثیر تعداد نے قائداعظمؒ کی اعلانیہ مخالفت کی اور تصورِ پاکستان کو مردود قرار دیا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ جن علماء نے پاکستان کی مخالفت کی وہ سب کے سب ضمیر فروش تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے قابل اور اپنے عقیدہ میں پختہ تھے۔ لیکن دوسری طرف وہ علماء بھی تھے جنہیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر پاکستان وجود میں آگیا تو ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ (وہ نظریہ پاکستان کے خلاف قسم قسم کے اعتراضات پیش کیا کرتے تھے[2]) ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ ان کا ذہن صاف نہیں تھا، یا وہ ملتِ اسلامیہ کے مسائل سے باخبر نہیں تھے۔ اس ساری مخالفت کے پیچھے اقتدار کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس مقام پر میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا اشارہ صرف ان علماء کی طرف ہے جو کھلے بندوں سیاسیات میں حصہ لیتے تھے، ان کی طرف نہیں جو دل میں خوفِ خدا رکھتے تھے اور جنہوں نے نہایت اخلاص، دیانت اور انکساری و فروتنی سے، قرآن کی تعلیم اور اسلام کی تبلیغ سے ملت کی خدمت کی ہے۔

---

[1] صدر محترم کی یہ کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے۔ اور ہم اس کے اقتباسات کا اردو ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارا ترجمہ اصل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس لئے ہمارے الفاظ مصنف کی طرف منسوب نہیں کئے جا سکتے۔ ان کی طرف ان کی کتاب کے اصل الفاظ ہی منسوب کئے جانے چاہئیں۔

[2] اس مقام پر مصنف نے ان اعتراضات کو وضاحت سے پیش کر کے ان کی بدلائل و براہین تردید کی ہے۔ ہم نے اس حصہ کو حذف کر دیا ہے۔

میں ان سیاسی علماء کا ذکر کر رہا ہوں جو اپنے آپ کو "مسلم نیشنلسٹ" نہیں بلکہ "انڈین نیشنلسٹ مسلم" کہتے تھے۔ اور یا تو انڈین کانگریس کے ممبر تھے یا ان جماعتوں اور گروہوں سے متعلق تھے جو کانگریس کے ہم نوا تھے۔ کانگریس اس زمانے میں، برصغیر میں ایک بہت بڑی سیاسی جماعت تھی، اس لئے اس جماعت کے ساتھ متمسک ہونے کی بنا پر، ان علماء کا بھی کافی اثر و اقتدار تھا۔ قائداعظمؒ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے؛ لیکن اس کے باوجود کانگریس اس پر مُصر تھی کہ انگریز کی طرف سے جو سیاسی ہیونی بھی تیار کیا جائے، اس میں کانگریس کے مسلمان ممبروں کو بھی (مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے) شامل کیا جائے۔ ان کانگریسی مسلمانوں کا خیال تھا کہ اگر ملک کو تقسیم نہ کیا جائے تو اس میں بہرحال کانگریس ہی برسراقتدار رہے گی اور اس لئے مسلمانوں کی زمام قیادت انہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ علماء جانتے تھے کہ برصغیر ہند میں مسلمانوں کی قیادت آہستہ آہستہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھ میں جا رہی ہے، جنہیں قائداعظمؒ جیسا جادو بیان اور صاحبِ اثر نمائندہ ہاتھ آگیا ہے۔ لہٰذا قائداعظمؒ، انگریز اور ہندو کے خلاف جو لڑائی لڑ رہے تھے، اس میں علماء کو اپنے اقتدار کے لئے سخت خطرہ نظر آ رہا تھا۔ قائداعظمؒ نے جس حسن و خوبی سے مسلمانوں کے مطالبہ کی وکالت کی، اور جس ایثار و خود فراموشی سے (وہ اس خدمت کو سرانجام دیتے رہے) اس نے ملت کے منتشر افراد کو ایک مستحکم قوم کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ یہ وہ جدید قیادت تھی جس سے علماء اس قدر خائف تھے[1] اور جس کے خلاف انہوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ بنا لیا تھا۔

"مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور علماء میں یہ تصادم نیا نہیں تھا۔ اس کی ابتداء انگریزوں کی حکومت کے آغاز ہی سے ہو گئی تھی اور تحریک پاکستان کے زمانہ میں یہ انتہائی شدت اختیار کر گیا تھا۔ ہندوستان پر، انگریزوں کے تسلط کے بعد، ان علماء نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم کے قریب تک پھٹکنے نہ دیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک بھی، مغربی علوم کے خلاف تعصب کا یہ سنگِ گراں مسلمانوں کے راستے سے ہٹ نہ سکا۔ اور انہوں نے ان علوم سے محرومی کی جو تاریکیاں اپنے اوپر از خود مسلط کر رکھی تھیں، وہ ان سے نکل نہ سکے۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز شاہ ولی اللہؒ کے زمانے سے ہوا جنہوں نے ماضی پر متفقانہ نظر ڈال کر مستقبل کے متعلق سوچنے کی طرح ڈالی۔ اس کے بعد، سرسید اس شمعِ حقیقت کو لے کر آگے بڑھے کہ جب تک مسلمان،

---

[1] جماعت اسلامی کے امیر اگرچہ نیشنلسٹ علماء کے زمرہ میں شامل نہیں تھے لیکن قائداعظمؒ کی قیادت سے وہ، ان سے بھی زیادہ خائف تھے۔ کیونکہ اس سے ان کے حصولِ اقتدار کا خواب، خوابِ پریشاں بن کے رہ جاتا تھا۔ لہٰذا وہ اس مخالفت میں نیشنلسٹ علماء سے بھی چار قدم آگے تھے۔ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ (طلوع اسلام)

عصرِ حاضر کے علوم سائنس اور ٹکنالوجی سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے' یہ دنیا میں ہرگز ہرگز ترقی نہیں کر سکیں گے انہوں نے اس حقیقت پر بڑا زور دیا کہ علم پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں۔ یہ ساری نوعِ انسانی کی مشترک متاع ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ علماء کے ایک گروہ کی طرف سے ان پر کفر کے فتووں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ لیکن ان لوگوں کی طرف سے اس قدر کیچڑ اچھالنے کے باوجود' سرسید کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی۔ اس نے اس تمام ہجوم مخالفت کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا اور قوم کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جوں جوں مسلمان' تعلیم جدیدہ میں ترقی کرتے گئے' امتِ مسلمہ پر علماء کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔"] (صفحات ۲۰۰-۲۰۲)

اس مخالفت میں' امیر جماعت اسلامی' ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک عجیب پوزیشن اختیار کر رکھی تھی۔ انہوں نے "دو قومی" نظریہ کی حمایت کر کے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس سے وہ نیشنلسٹ علماء کے زمرے سے تو الگ ہو گئے لیکن تحریکِ پاکستان اور اس کے بانی' قائدِ اعظمؒ کی مخالفت میں' یہ سب سے آگے تھے۔ وہ اس باب میں ہندو کی ہمنوائی کس انداز سے کرتے تھے' اس کا اندازہ دو ایک مثالوں سے لگائیے۔

(ہم اس باب میں متعدد مثالیں پیش کر سکتے ہیں لیکن قلتِ گنجائش کی بنا پر' اس وقت صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔ جب ۱۹۴۰ء میں' لاہور میں پاکستان ریزولیوشن پاس کیا گیا تو' مہاتما گاندھی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

> میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔
>
> (ہندوستان ٹائمز۔ ۶ اپریل ۱۹۴۰ء)

انہوں نے یہ کہا اور دوسری طرف سے مودودی صاحب نے مصرعہ اٹھایا کہ آپ بالکل بجا فرماتے ہیں مسٹر جناح اور ان کے رفقاء کیا جانیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ

> لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت رکھتا ہو۔ اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔
>
> (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ صفحہ ۴۳)

پاکستان کے مطالبہ سے مقصود یہ تھا کہ اس مملکت میں "حکومتِ خداوندی" قائم کی جائے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۲ نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا۔

> حکومتِ خداوندی کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور یہ مسلمانوں کا فعل عبث

ہوگا۔ اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اُدھر سے ہندو مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ ادھر مودودی صاحب مسلمانوں کو یہ کہہ کر تحریکِ پاکستان سے منحرف کرانے کے "جہاد" میں مصروف تھے کہ:

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے، ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں تو اس طرح حکومتِ الٰہیہ قائم ہو جائے گی، ان کا یہ گمان غلط ہے۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ۔ ص ۳۹)

آپ نے دیکھا کہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں کس طرح انگریز، ہندو، نیشنلسٹ علماء اور جماعت اسلامی دوش بدوش چل رہے تھے ـــــ لیکن للہ الحمد کہ ان سب کی متفقہ اور متحدہ مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اسے پھر صدرِ پاکستان کے الفاظ میں سنیئے۔ وہ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

"[تشکیلِ پاکستان] علماء کے لئے سب سے بڑی شکست تھی۔ لیکن یہ لوگ تو جونک کی طرح چمٹ جانے والے ہیں[1]۔ اور پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ قوت کا نشہ آسانی سے نہیں اترا کرتا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس ذہنیت کے حامل علماء نے از سرِ نو اپنی تنظیم کی۔ اب، جبکہ پاکستان وجود میں آچکا تھا، یہ حضرات لوگوں سے کہتے تھے کہ تم بتاؤ کہ علماء کے علاوہ اور کون اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسلامی حکومت کو کس طرح چلانا چاہیئے۔ ان میں سے بعض علماء تو ہندوستان میں رہ گئے، اور باقی تیزی سے پاکستان کی طرف لپکے، کہ یہاں کے مسلمانوں کو تباہی سے بچائیں" ـــــ یعنی، اگر یہ حضرات مسلمانوں کو پاکستان (کی مصیبت) سے بچا نہیں سکے تھے، تو اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح پاکستان کو مسلمانوں سے بچا لیں[2]۔ اس طرح آدھمکنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی بھی تھے۔ یہ صاحب، تحریکِ پاکستان کے سخت ترین مخالف رہے تھے۔ لیکن اب انہوں نے اسی پاکستان سے پناہ طلب کی۔ (پاکستان نے انہیں

---

[1] اصل لفظ (TENACIOUS) ہے۔ پنجابی زبان میں اس کا مفہوم "چم چیڑ" سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ یعنی جو ایک دفعہ چپک جائے تو پھر چھڑائے نہ چھوٹے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] صفحہ ۱۱ پر ملاحظہ ہو۔

پناہ دی تو) انہوں نے پاکستان کی بدقسمت قوم کو "مسلمان کرنے" کی مہم شروع کر دی۔ اس بزرگوار نے جو کچھ پاکستان میں دیکھا اس سے اس کا دل دہل گیا ــــ اُف! ایک غیر اسلامی ملک۔ اس میں غیر اسلامی حکومت اور وہاں کی قوم بھی ایسی جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک سچا دیندار مسلمان بھلا اس قسم کی حکومت کا وفاشعار کیسے ہو سکتا تھا؟ اس لئے انہوں نے حکومت کی کوتاہیوں، کمزوریوں اور نااہلیوں کو اچھال اچھال کر، لوگوں کو یہ یاد کرانے کی مہم شروع کر دی کہ اس قسم کے لوگ اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھنے کے قطعاً اہل نہیں۔

"لیکن یہ سب دکھاوا تھا۔ اصل مقصد یہ تھا کہ علماء کے (کھوئے ہوئے) اقتدار کو پھر سے قائم کیا جائے۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ قوم کی قیادت کا حق صرف انہی کو حاصل ہے۔ چونکہ تحریک پاکستان کی راہ نمائی اس تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی جس کا لیڈر خود مغربی تعلیم کا شہ نشان تھا اس لئے (اس سے) علماء کے وقار کو بڑی ٹھیس لگی تھی۔ وہ اس نقصان کی تلافی چاہتے تھے۔ اس کے لئے سیاسی علماء کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ خود اپنے آپ پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ اور اپنے طرزِ عمل کو بدلیں تاکہ لوگ اپنے مسائل کے حل کے لئے ان کے علم سے مستفید ہوں۔ اور دوسرا یہ کہ وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان پڑھ لیکن خداترس عوام کی نظروں سے گرا دیں۔ قدرتی طور پر انہوں نے مؤخر الذکر طریقِ عمل اختیار کیا۔ ایک ایسے معاشرہ میں جس نے ابھی ابھی صدیوں کی غلامی سے رستگاری حاصل کی تھی اور جس کے سامنے اپنے ملک کی تعمیرِ نو کے سلسلہ میں متعدد عملی مسائل تھے۔ نقائص اور کمزوریوں کا ہونا لابدی تھا۔ ان علماء نے معاشرہ کے ان نقائص کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اور ان نقائص کی نشاندہی کر کے، عوام کو اس امر کا یقین دلانا شروع کر دیا کہ ان کی زبوں حالی کی تمام تر ذمہ دار ملک کی حکومت ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک ایسی قوم کو جو اپنے سینے میں ہمیشہ آرزوؤں کو بیدار اور اپنے بازوؤں کو جوششِ کردار سے پُر رکھنے کی عادی تھی، ایک ایسی شکست خوردہ، یاس انگیز ملت میں تبدیل کر دیا جو ہر ایک کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتی اور ہر معاملہ کے تاریک پہلو کو سامنے رکھتی تھی۔ یہ علماء ان سادہ لوح عوام سے کہتے کہ وہ ملک کی تمام خرابیوں کا حل جانتے اور ان کی تمام مشکلات کو رفع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت کی کرسیوں پر وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ متمکن ہو بیٹھا ہے جس نے اسلام کو خیرباد کہہ کر، مغربی تہذیب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ لہٰذا وہ مجبور

(حاشیہ صفحہ ۹) ؎۔ اصل فقرہ یہ ہے: IF THEY HAD NOT BEEN ABLE TO SAVE THE MUSLIMS FROM PAKISTAN, THEY MUST NOW SAVE PAKISTAN FROM THE MUSLIMS. یہ فقرہ اب جامع اور برجستہ ہے کہ ہمارے خیال میں اسے ہر پاکستانی کی زبان پر ہونا چاہیئے۔

اور بے بس ہیں۔ چونکہ ملک میں کسی قیادت کے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ قوم کے تمام مسائل کا فوری حل پیش کر دیتی اس لئے علما نے نہایت آسانی سے عوام کے معتدبہ طبقہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔" (ص ۲۰۲-۲۰۳)

اس طرح پاکستان کی مخالفت دونوں محاذوں کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ہندو اپنی قوم اور ملک کو تیار کر رہا تھا کہ پاکستان کو بزورِ شمشیر فتح کر لیا جائے ــــ چنانچہ اس سلسلہ میں اب یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے کہ وہ (۱۹۶۵ء سے پہلے) دو تین مرتبہ پاکستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے ــــ دوسری طرف ایک مسلسل پراپیگنڈہ جاری تھا ــــ اور یہ کچھ ایک منظم مہم کے طور پر کیا جا رہا تھا۔ تاکہ ملک میں انتشار اور بد دلی پھیلتی جائے۔ بد دلی پھیلانا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ بالخصوص ان عوام میں جنہیں مذہب سے وابستگی ہو۔ ان کے سلسلہ میں کرنے کا کام اتنا ہی ہوتا ہے کہ قرنِ اول (زمانہ خلافتِ راشدہ) کے حکمرانوں کی سیرت و کردار کو سامنے لا کر، اس کا مقابلہ موجودہ حکمرانوں سے کر دیا جائے، اور پھر لوگوں سے کہا جائے کہ بتاؤ! اس قسم کے لوگ منبرِ رسولؐ اللہ اور مسندِ صحابہؓ پر متمکن ہونے کے اہل ہو سکتے ہیں! ــــ نفرت خود بخود پھیل جائے گی۔ نفرت اور بد دلی پھیلانے کی یہ مہم کسی خاص حکومت یا خاص حکمرانوں کے خلاف نہیں تھی۔ مقصد چونکہ ملک میں انتشار پھیلانا یا بد دلی پیدا کرنا تھا اس لئے یہ مہم ہر حکومت کے خلاف جاری رکھی گئی اور رکھی جا رہی ہے۔ قارئین طلوعِ اسلام اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم نے اس بیس سال میں، ہر اس حکومت کے خلاف جس نے کوئی فیصلہ بھی ایسا کیا جو ہماری دانست میں قرآن کے خلاف یا پاکستان کے مفاد کے منافی تھا، کس سختی سے تنقید کی ہے۔ لیکن اس تنقید سے مقصد تعمیری اصلاح تھی، نہ کہ انتشار خیزی۔ اس حقیقت سے کون ناواقف ہے کہ جس ملک میں انتشار پھیلانے اور بد دلی پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے اس کی بنیادیں کس قدر کمزور اور کسی بیرونی خطرہ کی مدافعت کے لئے اس کی دیواریں کس قدر بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ اس پراپیگنڈہ سے مقصد یہی تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ براہِ راست حکومت کے خلاف ایک گونہ بغاوت تک کے جراثیم پھیلانے میں بھی تامل نہیں کیا جاتا تھا۔ مثلاً تشکیلِ پاکستان کے بعد مغربی پاکستان کی حکومت نے اپنے ملازمین سے کہا کہ وہ حکومتِ پاکستان کی وفاداری کا حلف لیں۔ بعض سرکاری ملازمین نے جو جماعتِ اسلامی سے وابستہ تھے، امیرِ جماعت سے استصواب کیا۔ اور انہوں نے یہ رائے دی کہ حلف اس وقت تک ناجائز ہے جب تک یہ نظامِ حکومت پورے طور پر اسلامی نہ ہو جائے۔ بعض سرکاری ملازموں نے اس مشورہ کے مطابق حلف لینے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف محکمانہ کارروائی کرنا پڑی۔ اس سلسلہ میں نوائے وقت کی ۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ

> سول سکرٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اس نے حکومتِ پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں

اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظام حکومت اسلامی ہو۔

(بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص۴۹)

معاملہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا۔ اس جماعت نے پاکستان کی فوج کو برگشتہ کرنے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اپریل ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ (اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے مطابق) جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے جماعت کے ارکان کے فوج میں بھرتی ہونے کے متعلق کوئی فیصلہ کیا۔ جس کی روشنی میں اس جماعت کے قیم نے چند ماہ بعد ایک خط کے جواب میں لکھا کہ :

> موجودہ حکومت پاکستان غیر اسلامی ہے اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔

(نوائے وقت۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء۔ بحوالہ جماعت اسلامی پر ایک نظر ص۵۰)

اس کے باوجود، قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بہترین طبقہ نے فوج کی ملازمت کو ترجیح دی (اور یہ قوم کی بڑی خوش قسمتی تھی) لیکن ان لوگوں نے ان کے خلاف اس قدر گھناؤنا پروپیگنڈا شروع کیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہماری فوج کی بارکیں نہیں، (معاذاللہ) عیاشی کے اڈے ہیں جن میں شراب کی نہریں جاری ہیں ہر شب وہاں برہنہ ناچ ہوتے ہیں، جوئے خانے کھلے ہوتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کا نتیجہ تھا کہ فوج کے "تازہ نوجوانوں کو" ٹیڈی بائیز" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

اُدھر ہندوستان، پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرتا گیا اور ادھر ملک میں بددلی پھیلانے کی یہ مہم تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ترجمان القرآن میں لکھا گیا کہ

> غیب کا علم تو خدا کو ہے لیکن ہمارے اس ملک کا برسراقتدار طبقہ اسلام کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اگر وہ اس کے انفرادی تقاضوں سے نہیں تو کم ازکم اس کے اجتماعی تقاضوں سے ضرور گلو خلاصی کرانے کا آرزومند ہے۔ وہ اس مقصد کو ڈنکے کی چوٹ حاصل کرتا لیکن چونکہ قوم ابھی اس بات پر آمادہ نظر نہیں آتی اور اس بنا پر اس کے اندر قیادت و سیادت قائم کرنے کے لئے اسلام کی محبت کا دم بھرنا ناگزیر ہے اس لئے محتاط راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ کافرانہ افکار و نظریات اور ملحدانہ تصورات کے ساتھ اسلام کو چپکائے رکھا جائے۔ (ص۳)

آپ سوچئے کہ مذہب پرست عوام کو، ملک کی حکومت سے برگشتہ کرنے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر اور خطرناک

حربہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟

جب دشمن کو معلوم ہو کہ عوام میں اس قدر بد دلی پھیلائی جا چکی ہے اور اس کے پاس، فریقِ مخالف کے مقابلہ میں تین گناہ سے بھی زیادہ سپاہ اور اسلحہ بے شمار ہو، تو اسے ایسا دعوےٰ کرنے میں کیا باک ہو سکتا ہے کہ وہ صبح کو لاہور پر حملہ کرے گا اور شام کا پیگ (جامِ شراب) جم خانہ میں پیئے گا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں ۶ستمبر ۱۹۶۵ء کو ہندوستان کی طرف سے، پاکستان پر بلا کسی اعلان یا الٹی میٹم کے، شب خون مارا گیا۔ ہم نے اس پس منظر کا پیش کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ ہمارے جن پاسبانوں نے ایسے حالات میں ملک کو بچایا تھا، ان کی عظمت نکھر کر سامنے آجائے

اس طوفانِ بلا کو روکنے کے لئے ہمارے انہی، ٹیڈی بائیز، نے جو کچھ کر کے دکھایا، اس کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ، اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قوم اسے باور کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھی کہ 'انسان' بھی یہ کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ وجہ تھی جو اس قسم کے افسانے مشہور ہو گئے کہ "سفید گھوڑیوں والے بم اٹھاتے تھے۔ سبز عماموں والے گولے چلاتے تھے۔ تمام اولیاء عظام اپنے اپنے مقبروں سے نکل کر فوج کی صفوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ خود حضور رسالتمآبؐ بہ نفسِ نفیس شریکِ جہاد تھے۔" اس قسم کے افسانے ہر چند توہم پرستی پر مبنی تھے لیکن یہ تخلیق کردہ تھے اس جذبہ و احساس کے کہ جو کچھ جنگ میں ہوا تھا وہ انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہمارے خیال میں، ہماری قابلِ رشک فوج کے جیالے جوانوں کے لئے اس سے بڑا سرٹیفکیٹ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود مودودی صاحب، جو سالہا سال سے، قوم کے ان نوجوانوں کی سیرت و کردار میں کیڑے ڈالتے چلے آ رہے تھے، یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ[1]

> ہماری فوجوں نے اس زمانے میں ان اوصاف کا مظاہرہ کیا ہے جو کبھی قرونِ اولےٰ کے مسلمان فوجیوں کے متعلق ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔ (مشرق ۱۵/۹)

یہ شہادات اندرونِ ملک کی ہیں۔ ان کے ساتھ ہم ایک (اور سینکڑوں میں سے صرف ایک) شہادت

---

[1] جنگ شروع ہونے کے بعد قریب ایک ہفتہ تک، مودودی صاحب خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اور جب انہوں نے دیکھا کہ اس میں پاکستان کا پلڑا بھاری ہے تو اس قسم کے بیانات دینے شروع کر دیئے۔

..... بیرونِ پاکستان سے بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ شہادت ہے امریکہ کے مشہور میگزین "ٹائم" کے نامہ نگار لوئیس کرار کی جس نے (۱۲ ستمبر ۶۵ء) کو لکھا تھا۔

اس قوم کو کون شکست دے سکتا ہے جو موت سے آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو۔ میں بھارت ۔ پاکستان جنگ کو یاد رکھ سکوں یا نہ رکھ سکوں، لیکن میں پاکستانی فوج کے ایک نوجوان افسر کے اس تبسم جرأت نواز کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا (جس سے اس نے میرا استقبال کیا تھا) اس تبسم نے مجھ پر واضح کر دیا کہ پاکستان کے نوجوان کس قدر بہادر اور نڈر ہیں۔ یہ لوگ ۔۔۔ عام سپاہیوں سے لے کر جنرل افیسر کمانڈنگ تک ۔ آگ کے گولوں سے یوں کھیلتے تھے جیسے بچے گلیوں میں بنٹوں سے کھیلتے ہیں۔

میں نے جنرل آفیسر کمانڈنگ سے پوچھا کہ اس کا بالآخر راز کیا ہے کہ آپ اسقدر قلیل التعداد ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کو یوں مغلوب کئے جا رہے ہیں۔ اس نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مسکرایا اور کہا۔

"اگر حوصلہ، جرأت اور جذبہ حب الوطنی ایسی اجناس ہوتیں جو بازار سے خریدی جا سکتیں تو ہندوستانی انہیں، امریکی امداد کے ساتھ حاصل کر لیتے" (یہ متاعِ گراں بہا بازار میں بکتی نہیں، یہ سپاہی کے خونِ جگر میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ طلوع اسلام)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ ملت کے مقدر کے ان درخشندہ ستاروں نے کیا کچھ کر کے دکھایا تھا۔ اور کس طرح کر کے دکھایا تھا۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

جیسا کہ ہم نے سینکڑوں بار لکھا ہے، پاکستان کی سرزمین اس لئے حاصل کی گئی تھی کہ اس میں صحیح قرآنی نظام قائم کیا جائے۔ لہٰذا اس خطۂ زمین کو اغیار کے دستِ تطاول سے محفوظ رکھنے کے لئے جس نے جو کچھ کیا، ہمارا سرِ نیاز اس کے سامنے خم ہے۔ پاکستان اس کے اس احسانِ عظیم سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا ۔۔۔ وہ ہماری افواجِ قاہرہ کے سرفروش و جانباز ہوں یا وہ اربابِ نظم و نسق جنہوں نے اس قسم کی فوج تیار کی اور اسے ایسی عمدہ تربیت دی ۔۔۔ وہ ہمارے عوام ہوں جنہوں نے ایسے مخدوش حالات میں اس قسم کے ضبط و تحمل اور ایثار و خود فراموشی کا ثبوت دیا جس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی یا ہمارے وہ مخلص بہی خواہ جنہوں نے ایسے نازک وقت میں پکار کر کہا کہ ۔۔۔ گھبراؤ نہیں! ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

ان میں سے ایک ایک کا کارنامہ اور ایک ایک کی آواز ہمارے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ اور ہماری آنے والی نسلوں تک منتقل ہوتی چلی جائے گی۔ تاریخ ہمیں احسان فراموش قوم نہیں پائے گی۔ وقت ہمارے جذباتِ تشکر و امتنان کی شہادت دے گا۔

ہم نے 'جنگ ختم ہونے' کے اعلان کے فوری بعد لکھا تھا کہ یہ جنگ صرف ملتوی ہوئی ہے ختم نہیں ہوئی۔ نہ ہی بھارت اور پاکستان کی جنگ کبھی ختم ہو سکتی ہے۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے۔ اس کی وجہ ہم سے نہ پوچھئے، مسٹر چوآن کے اس بیان سے معلوم کر لیجئے جو انہوں نے جنگ کے بعد دیا تھا۔ مسٹر چوآن اس زمانہ میں بھارت کے وزیرِ دفاع تھے۔ انہوں نے کہا تھا:

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے خاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی ہفتے یا مہینے بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کیلئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

بھارت کی طرف سے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس پر ہمیں پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہے۔ جس حکومت نے پہلی جنگ (۱۹۶۵ء) کے لئے اس قدر شاندار اور ناقابلِ فراموش تیاری کر رکھی تھی، وہ اب اس تیاری سے کس طرح غافل ہو سکتی ہے۔ لیکن جہاں تک عوام کا تعلق ہے، ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ان کے دل میں اس خطرہ کو بیدار رکھنے کے لئے، نہ صرف یہ کہ حکومت نے کچھ نہیں کیا، بلکہ (دانستہ یا نادانستہ) ایسے اقدامات کئے گئے جن سے اس قسم کے احساسات مفلوج بلکہ معدوم ہوتے چلے گئے۔ ہماری دانست میں یہ بڑی غلط پالیسی تھی جو یہاں اختیار کی گئی۔ جس طرح حالتِ امن میں فوج کے ہر سپاہی کے دل میں اس ولولہ کا بیدار رکھنا ضروری ہوتا ہے اور اس سے ایسی مشقیں کرائی جاتی ہیں گویا کہ وہ میدانِ جنگ میں ہے۔ اسی طرح پبلک کے دل میں اس چنگاری کو زندہ رکھنے اور اسے ہوا دیئے چلے جانے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ہم اپنے اربابِ حکومت سے پُر زور درخواست کریں گے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے پورے پورے انتظامات کریں۔ ان کے علاوہ، ہم ملک کے اربابِ فکر و نظر سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ بھی ملک میں اس قسم کی فضا قائم رکھنے کے لئے، اپنے اپنے حیطۂ کاوش اور دائرہ عمل میں پوری پوری کوشش کریں اور عوام کو بتائیں کہ —— یہ گھڑی محشر کی ہے، ہم عرصۂ محشر میں ہیں۔

جنگ کے دوران ایک معجزہ ایسا بھی ہوا جسے آج تک نہ کوئی بھول سکا ہے، نہ بھول سکے گا۔ وہ معجزہ، وہ تھا جسے پرویز صاحب نے اپنی نشری تقریر میں ان مختصر الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ۵ ستمبر کی رات ہم سوئے تو اور قوم تھے اور ۶ ستمبر کی صبح کو جاگے تو بالکل دوسری قوم ـــــ یہ حقیقت ہے کہ جنگ کے دوران ہم وہ قوم نہیں رہے تھے جو اس سے پہلے اٹھارہ برس سے اس ملک میں بستی چلی آرہی تھی۔ یہ وہ قوم تھی جس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں، بلکہ جس کے عیوب و جرائم کا مرثیہ ہر ایک کی زبان پر تھا۔ لیکن اس کے بعد اسی قوم کی کیفیت یہ تھی کہ ان عیوب و جرائم کا، چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ قوموں میں اس قسم کی قلب ماہیت کی مثال بھی شاید ہی کہیں اور ملے۔ سوال یہ ہے کہ یہ قلب ماہیت ہوئی کیسے تھی؟ اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں لیکن ہمارے سامنے ایک اور ہی حقیقت ہے جسے بغور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اٹھارہ برس تک قوم یہ دیکھتی چلی آرہی تھی کہ یہاں ہر شخص کو اپنے اپنے فائدے کی پڑی ہے اور جس کے ہاتھ میں جو کچھ آتا ہے وہ اسے اپنے لئے سمیٹ کر لے جانے کی فکر کرتا ہے۔ کوئی کسی دوسرے کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ اس سے رفتہ رفتہ قوم کی ذہنی حالت یہ ہوگئی کہ (مثلاً) اگر کسی وقت اعلان ہوا کہ فلاں مقام پر ایک بہت بڑا کارخانہ کھل رہا ہے جو قوم کی فلاں ضرورت کو پورا کر دے گا، تو لوگوں کے لب پر ایک خندۂ استہزا کے ساتھ بے ساختہ اس قسم کے الفاظ آگئے کہ لیجئے! پاکستان کے "دو سو خاندانوں" میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ یا اگر یہ خبر سامنے آئی کہ فلاں مقام پر پل تعمیر ہو رہا ہے جس سے پبلک کو بڑی سہولت ہو جائے گی تو پبلک کی نگاہوں میں وہ کوٹھیاں پھرنے لگ گئیں جو اس پل کی تعمیر کے انچارج انجینئروں نے بنانی تھیں۔ غرضیکہ آپ ملک کی صنعتی ترقی کی ہزار داستانیں سنا دیتے اور امور رفاہِ عامہ کے لاکھ قصے دہرا دیتے، لوگوں کا ذہن اسی طرف جاتا تھا کہ یہ سب ان چند افراد کے حصولِ مفاد کے ذرائع ہیں جن کا کسی نہ کسی نوعیت سے ان امور کے ساتھ تعلق ہے۔

قوم کا ذہن اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا کہ ۶ ستمبر (اور اس کے سترہ دن بعد تک) اس نے ایک عجیب تماشہ دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ:

> سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں، نہایت خوبرو، بانکے، سجیلے، نوجوان، ہنستے، کھیلتے، اس میدان کی طرف جا رہے ہیں جہاں چاروں طرف موت منڈلا رہی ہے وہ وہاں ٹینکوں سے ٹکراتے ہیں، توپ کے گولوں کو اپنی چھاتیوں پر لیتے ہیں۔ ان کے جسم کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں اور ان کے لبوں پر تبسم ہے۔
>
> اور اس طرح جان دینے میں ان کا اپنا کوئی فائدہ نہیں!!!

عوام نے اس محیر العقول حقیقت کو پہلی مرتبہ اپنے سامنے مشہود دیکھا کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ انسان دوسروں کی خاطر اپنی جان تک بھی دیدے اور اس سے اس کے پیش نظر اپنا کوئی مفاد نہ ہو۔ اس احساس کا تاثر اس قدر طوفان انگیز تھا کہ اس سے انفرادی مفاد پرستی کا تصور تک دلوں سے خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا اور قوم کچھ سے کچھ ہوگئی۔ بے لوث خدمت اور بلامعاوضہ قربانی کی عملی مثال، ایک ایسا کیمیائی نسخہ ہے جس سے قوموں کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ مثالیں جنگ کے زمانے تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ جنگ ختم ہوئی تو پھر وہی سابقہ چلن پلٹ آیا۔ پھر وہی نفسانفسی شروع ہوگئی۔ اور قوم پھر وہی کچھ بن گئی جو کچھ وہ ۶ ستمبر سے پہلے تھی۔

سوال یہ ہے کہ زمانہ امن میں، اس قسم کی بے غرضی کی کیفیت کیسے پیدا کی جائے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور اس کا جواب بڑی گہری توجہ سے سننے کے قابل۔

آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ انسان اس قدر خود غرض کیوں واقعہ ہوا ہے اور وہ سب کچھ سمیٹنے کی فکر کیوں کرتا ہے؟ تحفظ خویش (PRESERVANCE OF SELF) اس کی حیوانی زندگی کا جبلی (INSTINC-TIVE) تقاضا ہے۔ اس تقاضا کی تسکین کے لئے وہ اپنا پورا پورا اطمینان چاہتا ہے۔ یہ تقاضا حیوانات میں بھی ہوتا ہے، لیکن حیوانات، مستقبل (FUTURE) کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ اس تقاضا کی فوری تسکین کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ انسان مستقبل کا تصور بھی کر سکتا ہے اس لئے وہ اپنے فوری تحفظ کے بعد مستقبل کا تحفظ بھی چاہتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا مستقبل متعین نہیں ہوتا۔ یعنی اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کتنے دن جینا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے تحفظ کے علاوہ، اپنی اولاد کے تحفظ کی بھی فکر ہوتی ہے۔ بنابریں، اسے کبھی تو یہ فکر ستاتی ہے کہ اگر میں کل کو مر گیا تو میری اولاد کا کیا بنے گا۔ اور کبھی یہ کہ میرے پاس بڑھاپے کا کچھ سہارا بھی ہونا چاہیئے۔ یہ ہیں اس کی طبیعی زندگی کے تقاضے جن کی تسکین کے لئے وہ اپنی فوری ضرورت پوری ہو جانے کے بعد، اور سمیٹنے کی بھی فکر کرتا ہے اور اس کی پھر کوئی انتہا ہی نہیں ہوتی ــ الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر ــ یہ ہوس آخری سانس تک اس کے ساتھ رہتی ہے۔

آپ اس تقاضے کو انسان سے الگ کر نہیں سکتے۔ اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ اسے اس امر کی ضمانت دے دی جائے کہ اس کی اور اس کی اولاد کی ضروریات زندگی رکی نہیں رہیں گی۔ اس کے لئے قرآن کریم نے کہا تھا کہ اسلامی معاشرہ کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کو اس امر کا یقین دلا دے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ‎(٦/١٥٢)

ہم تمہاری ضروریات زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔

اس یقین دہانی کے بعد اسے اس طرف سے اطمینان ہوجائے گا اور وہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر نہیں کریگا۔ باقی رہے وہ لوگ جو (ضرورت کے لئے نہیں بلکہ) محض ہوس کی خاطر سمیٹتے رہتے ہیں، تو یہ ایک نفسیاتی مرض ہے جس کا علاج یہ ہے کہ زاید از ضرورت کسی کے پاس رہنے نہ دیا جائے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے کہا تھا کہ:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲/۲۱۹)

یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر (دوسروں کی ضروریات کے لئے) دے دیں
ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب۔

یہ کیجئے، اور اس کے بعد دیکھئے کہ معاشرہ میں (CORRUPTION) کا کہیں نشان تک بھی دکھائی دیتا ہے؟

لیکن نوآزاد شدہ ممالک کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ قوم غالب، طبعی طور پر تو وہاں سے چلی جاتی ہے لیکن اپنے تمام اثرات پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ (بظاہر) آزاد ممالک، اپنی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی میں اسی سابق (حاکم) قوم کے غلام بنے رہتے ہیں۔ یہ اپنے لئے کوئی دوسری نہج سوچ ہی نہیں سکتے۔ اور ان مناہج کو برقرار رکھنے کے لئے اقوامِ غالب انہیں ہر طرح کی مدد بھی دیتی رہتی ہیں، اسی میں اُن کا (اقوامِ غالب کا) فائدہ ہوتا ہے۔ اس وقت تمام نوآزاد ممالک کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ یہ مکڑی کے جالے ان بچاری مکھیوں کو اپنے چنگل سے نکلنے ہی نہیں دیتے۔

اقوامِ غالب، صدیوں کے استحصال (EXPLOITATION) سے اپنے ہاں بے انتہا دولت اکٹھی کر لیتی ہیں۔ پھر وہ مغلوب اقوام کی عادتیں اس قدر بگاڑ جاتی ہیں کہ ان کی مصنوعات کے بغیر ان کا گذارہ ہی نہیں چلتا۔ اس سے اِن اقوامِ مغلوب کی گاڑھے پسینے کی کمائی جو ان کے اپنے ملک کی نشو و نما میں صرف ہونی چاہیئے تھی، مسلسل اُن اقوام کی طرف بہے چلی جاتی ہے۔ اس سے وہ اقوام، اپنے ہاں رفاہی مملکت (WELFARE STATE) قائم کر لیتی ہیں جو ان کے نظامِ سرمایہ داری کے نقصانات کی ایک حد تک تلافی کر دیتی ہے۔ نوآزاد ممالک یہ تو دیکھتے نہیں، اور نظام اپنے ہاں وہی سرمایہ دارانہ رکھتے ہیں۔ نتیجہ اس کا وہ عالمگیر (CORRUPTION) ہے جو اس وقت دنیا کے تمام نوآزاد ممالک میں عام ہو رہی ہے۔

دیگر ممالک کو اس نظام (سرمایہ داری) کو بدلنے میں اگر کوئی دشواریاں پیش آ رہی ہیں، تو ان کا حل وہیں پر سوچا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیں حیرت اپنے پر ہے۔ ہم نے اس مملکت کو حاصل ہی اس لئے کیا تھا کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی کا نفاذ ہو۔ اسلامی نظام، سرمایہ داری کا سخت دشمن ہے۔ اس لئے اگر ہم اس نظام کو بدل

دیں تو یہ اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہوگا جس کے لئے ہم نے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا تھا۔

لیکن اس باب میں، اقوامِ غالب "مذہب" کو اپنا آلۂ کار بناتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں جماعت اسلامی کی طرف سے مسلسل یہ شور مچایا جا رہا ہے کہ سوشلزم کا معاشی نظام، اسلام کے خلاف ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی طرف سے یہ پراپیگنڈہ بھی جاری ہے کہ آبادی پر کنٹرول (فیملی پلاننگ) بھی خلافِ اسلام ہے۔ ان دونوں چیزوں کو آپ یکجا کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس قسم کے پراپیگنڈہ سے متاثر ہونے والا ملک، اقوامِ غالب کے مکڑی کے جالے سے کبھی چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے؟

ہمارے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے معاشی نظام (ECONOMIC PATTERN) کو تبدیل کر کے، اس کی جگہ قرآن کا معاشی نظام اختیار کریں۔ اور اس کے ساتھ ہی، اپنے معاشرتی نظام کو از سرِ نو قرآن کی مستقل اقدار کی بنیادوں پر منتشکل کریں۔ یہی وہ اقدار ہیں جن کی خاطر انسان اپنے ہر طبیعی تقاضے کو قربان کر سکتا ہے۔

اپنے ہاں یہ تبدیلی پیدا کریں اور اس کے بعد،

بھارت اور اس کے تمام حمایتیوں کو للکار کر کہہ دیں کہ اگر کسی میں ہمت ہے تو ہمارے خلاف انگلی اٹھائے اور پھر دیکھے کہ کس طرح اس کا ہاتھ کاٹ کر نہیں رکھ دیا جاتا۔

جنگ پاکستان کے شہداء کی یاد منانے کا یہی ایک طریق ہے۔

ضروری اطلاع برائے خریداران

جن احباب کو نظامِ ڈاک کے کسی سقم کی وجہ سے پرچہ نہ ملے وہ دس تاریخ تک انتظار کرنے کے بعد ناظم ادارہ کو پرچہ نہ ملنے کی اطلاع بھیجیں۔ جن خریداران سے یہ اطلاع پندرہ تاریخ تک پہنچ جائے گی انہیں بیس تاریخ تک پرچہ ڈاک سے بلا قیمت دوبارہ ارسال کیا جائیگا۔ لیکن پندرہ تاریخ کے بعد رپورٹ آنے کی صورت میں یہ اگلے شمارہ کے ساتھ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

طلوع اسلام کا نیا شمارہ، ہر ماہ کی آخری تاریخ کو انتہائی احتیاط کیساتھ چیک کر کے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(ناظم)

عنایت اللہ

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں

عنایت اللہ صاحب، حلقہ طلوع اسلام میں ایک عرصہ سے متعارف ہیں لیکن ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد انہوں نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی ہے انہوں نے جہاد پاکستان کے غازیوں اور شہیدوں کی یاد کے چراغ اپنے خونِ جگر کے روغن سے مسلسل جلائے رکھے ہیں وہ اس دو سال کے عرصہ میں چھاؤنی چھاؤنی نگر نگر ۔ اور بستی بستی پھرے ہیں تاکہ تاریخ پاکستان کے اس محیرالعقول معرکہ کے عینی شاہدوں سے واقعات سنیں اور اکٹھے کریں۔ اس طرح انہوں نے چمن میں بکھری ہوئی اس داستان کی ایک ایک پتی کو اپنی فرطِ عقیدت سے جمع کیا ہے۔ انہی میں سے چند شگفتہ و شاداب پتیاں وہ بزم طلوع اسلام میں بھی لے کر آئے ہیں جنہیں شکریہ کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی ہفت روزہ "ٹائم" کے وقائع نگار، لوئیس کراز نے جنگ ستمبر کے دوران میں سیالکوٹ سیکٹر کے پھیلے ہوئے، میلوں وسیع کھیتوں میں بھارت کی بکتر بند قوت کے جلے ہوئے پرچھے (جنہیں بھارتی ٹینک کہا کرتے تھے) اپنی آنکھوں سے دیکھے تو اس نے اس سیکٹر کے پاکستانی کمانڈر سے حیرت زدہ ہو کر پوچھا ـــــ "آپ نے اس قدر مختصر سی طاقت سے بھارت کی اس قدر زیادہ قوت کو کس طرح شکست دے لی ہے"؟

ہمارے جری کمانڈر نے فاتحانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "اگر حوصلہ اور جذبہ روپے پیسے سے خریدا جا سکتا تو بھارت کے جنگ پسند حکمران یقیناً یہ دونوں چیزیں بھی امریکی امداد میں حاصل کر لیتے"۔

ہمارے فاتح سالار کا یہ جواب اپنی جگہ مکمل ہے ـــ حوصلہ اور جذبہ ـــ اس جواب نے یہودی ہفت روزہ "ٹائم" کے امریکی جنگی وقائع نگار کو مطمئن کر دیا تھا، لیکن تاریخ مطمئن نہیں۔ تاریخ تفصیلات پوچھ رہی ہے،

کیونکہ جنگ ستمبر میں ذاتی حوصلے، جذبے اور حب الوطنی کے کچھ ایسے مظاہرے ہوتے ہیں جنہیں تاریخ اپنی جھولی میں ڈالتے سے لرز رہی ہے، کہ اسے اس متاعِ عظیم کی وسعت اور اپنی تنگ دامانی کا پورا پورا احساس ہے۔

یہ سوال کہ اس قدر تھوڑی طاقت نے اتنی زیادہ قوت کو کس طرح شکست دے لی ہے؟ لوئیس کرار نے نہیں، تاریخ نے پوچھا ہے۔ تاریخ نے یہ سوال صدیوں پہلے بدر کے میدان میں بھی پوچھا تھا۔ تاریخ بدر کے میدان میں بھی لرز اٹھی تھی اور صدیوں بعد تاریخ نے ایک بار پھر لاہور اور سیالکوٹ کے میدانوں میں اپنے سینے میں وہی لرزہ محسوس کیا ہے۔ لیکن اب کے یہ لرزہ نہیں، بھونچال کا شدید جھٹکا تھا جس نے عالمی جنگوں کی تاریخ کی بنیادوں تک کو ہلا ڈالا ہے کیونکہ اس نے پاک فوج کی پنجاب رجمنٹ کے نائک "غلام احمد" کا نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ آیئے، اسی غازی کا کارنامہ سن لیجئے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب اپنے اگلے دستے بی آر بی کے اگلے کنارے سے ہٹ کر دوسرے کنارے پر مورچہ بند ہوتے تو بٹالین کمانڈروں، بریگیڈ کمانڈروں اور خود ڈویژن کمانڈر نے بھی محسوس کیا کہ اپنے سپاہی دفاع پر نہیں لڑنا چاہتے، وہ بڑھ کر دشمن پر وار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نفری بہت تھوڑی تھی۔ تین چار پیادہ پلٹنیں اور ایک ٹینک یونٹ کوئی نفری نہیں ہوتی۔ اس ذرا سی نفری کا سامنا بھارت کے پورے ڈویژن (نمبر ۱۵) سے تھا جسے نہ صرف طیاروں کی بلکہ اڑھائی سو سے زیادہ توپوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس ڈویژن کو بھارت کے نامور چھاتہ بردار نمبر پچاس بریگیڈ کی کمک مہیا کی گئی تھی اور اس سے پیچھے امرتسر کے گرد و نواح میں نمبر ۲۳ ماؤنٹین ڈویژن (جسے بھارتیوں نے چین کے بہانے امریکہ سے تیار کرایا تھا) پابرکاب تھا۔ جنرل چوہدری کا یہ اعلان کہ وہ نو بجے تک لاہور پر قابض ہو چکا ہوگا، مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پاکستان کے پاس اس کے لشکر کی اچانک یلغار کو روکنے کے لئے کچھ نہیں۔ ہوا بھی یوں ہی کہ پاک فوج نے ڈوگرئی سے راوی سائیفن (مقبول پورہ) تک کے تمام اگلے دستوں کو پیچھے ہٹا لیا تھا اور دشمن بی آر بی تک تقریباً آن پہنچا تھا۔ لیکن پاک فوج کے ان مٹھی بھر دستوں کے مورچوں سے نعرۂ تکبیر کے ساتھ دو اور نعرے گونجے — "پاکستانیو! یہ وقت پھر نہیں آئے گا" — اور دوسرا نعرہ تھا — "پاکستانیو! دلی پہنچو" — اور ایک تیسرا نعرہ بھی گونجا جو کئی بار سنائی دیا — "پاکستانیو! آج بے غیرت نہ ہو جانا۔ شاستری کے گھر تک پہنچو"۔

جس طرح جنرل چوہدری نے اپنی نفری کو دیکھ کر جنگ کی اسکیم بنائی تھی اگر اسی طرح ہمارے کمانڈر اپنی صرف نفری کو پیش نظر رکھتے تو ان کے سامنے ایک ہی جنگی چال تھی کہ لاہور سے بھی پیچھے ہٹ کر راوی کے شاہدرے والے کنارے مورچہ بند ہوتے۔ لیکن انہوں نے جب اپنے سپاہیوں کا غیظ و غضب اور بے پناہ جذبہ دیکھا تو بریگیڈیئر آفتاب احمد نے ڈویژن کمانڈر کو خود اعتمادی سے کہا — "جناب! ہم دشمن پر

جوابی حملہ کر سکتے ہیں "۔ چنانچہ لاہور کی دہلیز پر وہی فیصلہ ایک بار پھر کیا گیا جو صدیوں پہلے بدر کے میدان میں کیا گیا تھا۔ اور جسے صلاح الدین ایوبی نے کئی بار دہرایا تھا۔ یہ وہی فیصلہ تھا جو ایوبی کے پوتے الکمال کی بیوی شجرۃ الدّر نے منصورہ کے میدان میں صلیبیوں کے خلاف کیا تھا۔ (الکمال شہید ہو گیا تو اس کی بیوی نے فوج کی کمان سنبھال لی تھی۔ دوسری طرف صورت یہ تھی کہ سارا یورپ مسلمانوں سے فیصلہ کن معرکہ لڑنے کے لئے امڈ آیا تھا۔ شجرۃ الدّر نے پہلا حکم یہ دیا تھا کہ کسی کو یہ علم نہ ہونے پائے کہ سالارِ اعظم الکمال شہید ہو گیا ہے۔ باقی داستان بہت طویل ہے)

بدر کا فیصلہ جب لاہور کے میدان میں دہرایا گیا تو اپنی صرف دو کمپنیاں جن کی نفری تین سو تیرہ ہی سے لگ بھگ تھی، چھ ستمبر کی بھیانک رات کی تیرگی میں راوی سائیفن کی راہ بی آر بی سے پار چلی گئیں اور دشمن کی چار پلٹنوں (ہر پلٹن کی نفری ایک ہزار) پر ٹوٹ پڑیں اور دشمن کی چار ہزار نفری کو دھکیلتی، لہولہان کرتی اپنی سرحد سے نکل کر بھارت کی رانی اور طوطی کی چوکیوں پر قابض ہو گئیں ــــ تاریخ اسلام کے لئے یہ معرکہ کوئی انوکھا نہیں لیکن عالمی جنگوں کی تاریخ سوچ میں بیٹھی ہے، سر جھکائے ہوئے!

میں ایک طویل داستان کو بے دردی سے سمیٹتا چلا جا رہا ہوں لیکن مجبور ہوں کیونکہ یہ ضخیم کتابوں کا (ایک کتاب کا نہیں کئی کتابوں کا) موضوع ہے۔ ہماری دو کمپنیوں نے بی آر بی سے پار ڈوگرئی سے ڈیڑھ میل آگے (واہگہ روڈ کے تیرہویں اور چودھویں سنگِ میل کے درمیانی علاقہ میں) جا مورچے کھودے۔ پہلے روز ان کمپنیوں کی نفری تین سو چھبیس (۳۲۶) تھی اور فائر بندی کے وقت وہ کل پچاس رہ گئے تھے ــ یہ مورچے لاہور کی قربان گاہ تھی جہاں یہ جانباز لہولہان ہوتے رہے، شہید ہوتے رہے، کٹتے رہے، مگر جمے رہے ــــ ان میں بیشتر کی قبروں کے نشان تک مٹ چکے ہیں کیونکہ دشمن لاشوں کو پیچھے لانے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ انہیں ان کے ساتھی وہیں کہیں (بعض کو مورچوں میں ہی) دفن کرتے رہے۔ پھر خود بھی شہید ہو گئے اور مٹی کی ان ڈھیریوں پر ٹینک پھر گئے۔ اب ان پر کھیتیوں کی ہریالی جھوم رہی ہے۔ گندم کے کسی خوشے کو سونگھ کے دیکھو، اس میں سے تازہ لہو کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔

ہاں تو میں نائک غلام احمد کی بات کر رہا تھا وہ انہی مورچوں میں تھا۔ میں اس سرفروش غازی کو علامت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ ذرا دیکھئے کہ خاکی وردی میں لپٹے ہوئے ہمارے یہ گمنام سے ان پڑھ دیہاتی کس طرح موت کے ساتھ چھیڑ خانی کرتے رہے ہیں۔ غلام احمد ٹینک شکن گن (آر آر) کا گنر تھا۔ یہ گن جیپ پر نصب ہوتی ہے اور زمین پر بھی لگائی جا سکتی ہے۔ ایک روز دشمن کے بہت سے ٹینک واہگہ سے ذرا اس طرف شمال سے جنوب کی طرف ایک دوسرے کے پیچھے سڑک پار کر رہے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ لاہور پر ایک اور حملہ

کرنے کے لئے بکتر بند نوٹ کہیں مرکوز کر رہا ہے۔ ڈوگرئی کے اگلے مورچوں کے پیادہ سپاہی ان ٹینکوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتے تھے۔ ٹینک سے ٹینک یا طیارہ لڑا کرتا ہے۔ لیکن نائک غلام احمد نے اپنے کمپنی کمانڈر سے کہا ۔۔ "جناب! ایک تماشہ کروں؟" ۔۔ ذرا غور فرمایئے، اُس نے "تماشے" کا لفظ استعمال کیا تھا ۔۔ اور کس وقت کیا تھا؟

اس کے کمپنی کمانڈر نے مجھے بتایا کہ میں ہنس پڑا اور کہہ دیا ۔۔ "ہاں غلام احمد کرو تماشہ۔ مرنے سے پہلے تماشہ ہی دیکھ لیں"۔۔ کمپنی کمانڈ بتاتے ہے کہ میں اسے محض مذاق سمجھ رہا تھا اور مجھے قطعاً علم نہیں تھا کہ غلام احمد سنجیدگی سے کچھ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے مذاق کا جواب مذاق میں دیا تو غلام احمد بھاگ کر اپنی آر آر کی جیپ پر جا بیٹھا۔ اور جیپ کو ڈھکی چھپی پوزیشن سے نکال کر کھلی سڑک پر لے گیا۔ وہاں سے اُس نے جیپ کو واہگہ کی سمت (جہاں سے دشمن کے ٹینک گزر رہے تھے) انتہائی تیز رفتار پر چھوڑ دیا۔ ہم دم بخود کہ کیا شخص خودکشی کرنے جا رہا ہے۔ سامنے دشمن کے ٹینک، اِدھر یہ اکیلا، اور وہ بھی کھلی سڑک پر۔ مگر وہ دُور نکل گیا تھا، اُسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔

لیکن نائک غلام احمد "تماشہ" دکھانے گیا تھا۔ اُدھر ایک اور ٹینک سڑک پر چڑھا، اِدھر غلام احمد نے جیپ کی اسی تیز رفتار سے ایک گولہ فائر کیا۔ دشمن کا ٹینک کئی فٹ اوپر اچھلا اور آگ کا مہیب شعلہ بن گیا۔ دوسرا ٹینک سڑک کی طرف آرہا تھا۔ وہ ابھی کھیتوں میں تھا۔ غلام احمد نے اسی رفتار پر جیپ کو ذرا گھمایا اور دوسرا گولہ فائر کر دیا۔ دشمن کا وہ ٹینک زخمی بھینسے کی طرح چکرایا اور ساکن ہو گیا۔ غلام احمد نے جیپ روک لی اور اُلٹے گیئر میں ڈال دی، کیونکہ باقی ٹینکوں نے اپنی گنوں کا رُخ اِس طرف کر لیا تھا۔ نائک غلام احمد کی جیپ کھلی سڑک پر ان کے سامنے تھی۔ بیک وقت دو تین گولے غلام احمد کی جیپ کے سامنے آکر پھٹے۔ جیپ کا انجن صاف اُڑ گیا اور غلام احمد زخمی ہو گیا۔ لیکن اُس نے جیپ سے گن الگ کر لی۔ اس دوران اس کے اردگرد گولے پھٹتے رہے اور اس کا خون تیزی سے بہتا رہا۔ لیکن وہ گن کو قریب ہی زمین پر آڑ میں لے گیا اور فائر کرتے کرتے رینگ رینگ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ آخر وہ جسم کا آدھا خون بہا کر مورچے میں واپس آگیا۔ کمپنی کمانڈر نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ اور کہا ۔۔ "بیوقوف! تم مرنے گئے تھے؟" ۔۔ غلام احمد نے ہنس کر کہا ۔۔ "نہیں جناب! میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ تماشہ کرنے جا رہا ہوں؟" ۔۔ اور جب اُسے ہسپتال بھیجا جانے لگا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ "یہ تو معمولی زخم ہیں"۔۔ اُس نے ان گہرے زخموں کو اپنی فیلڈ پٹی سے چھپا لیا۔ فائر بندی تک اُس نے اسی طرح کئی اور ٹینک تباہ کئے تھے۔

اور اسی طرح کا ایک اور حوالدار اپنی مورچوں میں تھا۔ فائر بندی سے ایک روز پہلے دشمن ان اگلے مورچوں

کو کچلنے کے لئے بے شمار نفری سے حملہ آور ہوا اور اس قدر قریب آگیا کہ گرنیڈوں کی جنگ شروع ہوگئی اس حوالدار کا بایاں بازو کہنی کے قریب سے کٹ گیا۔ اسی ہاتھ سے وہ گرنیڈوں کے پن نکالتا تھا۔ وہ ہاتھ ہی جسم سے الگ ہوگیا۔ اس جانباز نے پرواہ نہ کی اور دانتوں سے پن نکال کر گرنیڈ پھینکتا رہا۔ کٹے ہوئے بازو سے خون فوارے کی طرح بہتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ خون بہنے سے بے ہوش ہوگیا۔

ذکر جب انفرادی شجاعت کا آجاتا ہے تو بات کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ صرف ایک کارنامہ اور سن لیجئے۔ عبدالمتین شہید بنگالی تھا۔ وہ پاک فوج کی ایک ٹینک رجمنٹ کا گنر (توپچی) تھا۔ اُس کے ٹینک کو گولہ لگا اور ٹینک جلنے لگا۔ اُس کے ساتھ ایک دفعدار اور دو اور کر تیو (CREW) تھے۔ سب ٹینک سے کود آئے لیکن ٹینک کی توپ ابھی محفوظ تھی اور عبدالمتین شعلوں کی لپیٹ میں گولے فائر کر رہا تھا۔ دفعدار نے چلا کر کہا "متین! کود آؤ، ایمونیشن پھٹنے والا ہے"۔ متین شہید جانتا تھا کہ اُس کے ٹینک میں ایمونیشن رکھا ہے جو دوسرے ہی لمحے پھٹے گا۔ لیکن اُس نے چیخ کر جواب دیا — "دشمن رینج (RANGE) میں ہے"۔ اور اس نے نہایت تحمل سے دشمن کے دو ٹینک تباہ کر ڈالے۔ مگر اُس کا ایمونیشن ہولناک دھماکے سے پھٹ گیا — عبدالمتین شہید کی قبر کہاں ہے؟ — ہمارے سینوں میں! اُس کی لاش کا تو نشان بھی نہیں رہا تھا۔

میں نے یہ تین مثالیں پاک افواج کے بنیادی جذبے کی علامت کے طور پر پیش کی ہیں۔ ان مثالوں کی فہرست بہت ہی طویل ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے بھارت کے اکیس (۲۱) ڈویژنوں کو سات ڈویژنوں سے روکا تھا۔ یہاں میں ایک بات واضح کردوں — ڈویژنوں کے حساب سے ہماری فوج انڈین آرمی کا تیسرا حصہ تھی۔ لیکن بھارت کے ڈویژن کی نفری پاک فوج کے ڈویژن کی نفری سے ڈیڑھ پونے دو گنا زیادہ ہوتی ہے اس حساب سے پاک فوج کی نفری انڈین آرمی کا چھٹا حصہ تھی۔ لیکن بعض محاذوں پر ہمارے ایک سپاہی کا مقابلہ دس بھارتی سپاہیوں سے اور ایک ٹینک کا مقابلہ بارہ سے سولہ ٹینکوں تک تھا۔

اس فوقیت کے علاوہ انڈین آرمی نے اچانک حملہ کر کے پاک فوج کو تمام تر جنگی فوائد سے محروم کر دیا تھا۔ میدانِ جنگ میں اُس فوج کی فتح یقینی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت سے رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں حریف کو بیدار کئے بغیر اچانک حملہ کر دے۔ اور اُسے مورچہ بند ہونے کی مہلت نہ دے اور اُسے کوئی چال سوچنے سمجھنے INITIATIVE سے محروم کر دے۔ پہلے روز انڈین آرمی نے پاک فوج کو اِسی ہولناک پوزیشن میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھارت کے ففتھ کالم نے پاکستان کے شہریوں خصوصاً لاہور والوں کا حوصلہ اور پاک فوج پر اعتماد توڑنے کے لئے دو کاری ضربیں لگائیں۔ ایک یہ کہ بی بی سی اور وائس آف امریکہ سے اعلان کرا دیا کہ

انڈین آرمی لاہور پر قابض ہو گئی ہے اور دوسری افواہ یہ پھیلائی کہ "لاہور کے ڈویژن کمانڈر میجر جنرل سرفراز کو گولی مار دی گئی ہے کیونکہ جب حملہ ہوا تو وہ شراب میں مست پڑا تھا۔" (حالانکہ جنرل سرفراز کو لاہور کے کامیاب دفاع کے صلے میں ہلال جرأت دیا گیا)۔ مقصد اس سے یہی تھا کہ فوج کی دیوار کے پیچھے اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے والے شہری محسوس کر لیں کہ ان کی وہ حفاظتی دیوار ٹوٹ پھوٹ چکی ہے۔

جنگ کا کوئی بھی ماہر اور مبصر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ پاک فوج کے مختصر سے دستے انڈین آرمی کی یلغار کو روک لیں گے۔ قوت کی زیادتی کے علاوہ وہ دیکھ رہے تھے کہ جنرل چوہدری نے پاک فوج کو تمام تر جنگی فوائد سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن یہ ماہرین اور مبصر آج بھی سوچ رہے ہیں کہ پاک فوج نے یہ معجزہ کس طرح کر دکھایا؟

جب پاک فوج نے بھارت کے جنگ پسندوں کو لاہور کی دہلیز پر روک لیا اور بھارتیوں کی لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ تو بھارت کے چوہدری نے دوسری چال چلی۔ اس نے محاذ کو پھیلانا شروع کر دیا اور محاذ ایک ہزار میل تک پھیل گیا۔ انڈین آرمی پاکستان کی دفاعی لائن میں شگاف ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ قوت کے زور سے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر اس نے پاک فوج کو ایک ہزار میل لمبے محاذ پر پھیلا کر مقصد پا لیا۔ کیونکہ پاک فوج کی نفری اس قدر طویل محاذ کے لئے تھوڑی تھی۔ چنانچہ دفاعی لائن میں از خود شگاف پیدا ہو گئے۔ ہمارا دفاع جو پہلے روز ایک موٹے رسّے کی طرح مضبوط تھا، کھنچتے کھنچتے کچا دھاگہ بن گیا۔ پاکستان کا مستقبل اب اس کچے دھاگے سے لٹک رہا تھا۔

دفاع کی مضبوطی کو اس کی گہرائی سے ناپا جاتا ہے۔ اگلے مورچے، پچھلے مورچے اور اس سے پیچھے کمک اور سپلائی کا نظام۔ مثلاً دوسری جنگِ عظیم میں جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تھا تو روس کے دفاع کی گہرائی ایک سو پچاس میل تھی۔ لیکن جرمن فوجوں نے محاذ کو پھیلا کر روسیوں کے دفاع کی دوسری اور تیسری تہہ کو بھی اگلے مورچوں پر آ جانے پر مجبور کر دیا تھا اور دفاعی گہرائی ختم کر کے جرمن فوجیں ماسکو تک جا پہنچیں تھیں یہی چال چوہدری نے چلی۔

جنرل چوہدری نے پاکستان کو فتح کرنے کی جو سکیم بنائی تھی وہ کسی پہلو سے عیب نہیں تھی۔ میں اس کی ایک چال کی داد دیتا ہوں کہ اس نے پاکستان کے ٹینکوں کو ایک ہزار میل لمبے محاذ پر پھیل جانے پر مجبور کر دیا اور اپنے ٹینکوں (نمبر ۱ آرمرڈ ڈویژن جس میں دو ٹینک بریگیڈیں، نمبر ۲ کیولری اور نمبر ۲ لانسرز اضافی تھیں) کو ایک جگہ مرکوز کر لیا اور سیالکوٹ سیکٹر پر جنگوں کی تاریخ کا شدید ترین بکتر بند حملہ کر دیا۔ اس بکتر بند قوت کے ساتھ اسکے دو انفنٹری (نمبر ۲۶، نمبر ۱۴) اور ایک مونٹین ڈویژن، نمبر ۶ (جس میں جنگ سے چند دن پہلے تک امریکی

افسر موجود تھے) بھی تھے۔ جب اس ہیبت ناک قوت نے سیالکوٹ پر یلغار کی تو پاک فوج کو کئی محاذوں سے ٹینک نکال کر سیالکوٹ کے دفاع کے لئے بھیجنے پڑے۔ اس دوران پاک فوج کے دو انفنٹری بریگیڈوں (یعنی پیادہ انسانوں) نے دشمن کے ٹینکوں کو اپنی چھاتیوں پر روکے رکھا۔ اور جان کے نذرانے دیتے رہے۔ سیالکوٹ سیکٹر میں (اور ہر محاذ پر) پاکستان کی دفاعی لائن کی کوئی گہرائی تھی ہی نہیں۔ نہ پچھلے مورچے تھے، نہ اس سے پچھلے۔ اگر ہمارے اگلے مورچے اکھڑ جاتے تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا جو دشمن کو روکتا۔

کھیم کرن سیکٹر میں ٹینک رجمنٹ کے ایک رسالدار نے مجھے بتایا کہ بھارتی توپخانے کے گولے ہمارے اگلے دستوں سے دور پیچھے گر رہے تھے۔ کیونکہ دشمن ہماری سیکنڈ لائن کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ گولے خلا میں ضائع ہو رہے تھے۔ ہماری سیکنڈ لائن تھی ہی نہیں۔ میدان جنگ میں دوسری اور تیسری لائن انتہائی ضروری ہوتی ہے ورنہ شکست لازمی ہوتی ہے۔

جنرل چوہدری کی اسکیم بے عیب نہیں تھی۔ وہ پاک فوج کو اسی پوزیشن میں لانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے جنگ کی اسکیم تیار کرتے وقت اپنی بے پناہ قوت اور پاک فوج اور فضائیہ کی ذاتی نظری ہی کو سامنے رکھا تھا۔ وہ دو باتیں بھول گیا تھا۔ ایک یہ کہ پاک فوج اور فضائیہ بھی لڑنا جانتی ہے۔ اور دوسری ضروری بات جو اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی، یہ تھی کہ پاکستان کی دفاعی لائن کے اگلے مورچوں پر تو پاک فوج ہے لیکن، پچھلے مورچوں میں دس کروڑ پاکستانی شہری ہیں ـــــ دس کروڑ مردانِ حُر، مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ـــــ جنرل چوہدری بریگیڈوں اور ڈویژنوں کے حساب سے قوت کا اندازہ لگاتا رہا لیکن اُسے قطعاً خیال نہ رہا کہ پاک فوج کا ہر ایک سپاہی اپنی جگہ مکمل قوت ہے۔ میدانِ جنگ میں قوت کو یونٹوں سے ناپا جاتا ہے، لیکن پاک فوج کی ہر اکائی اپنی جگہ مکمل تھی۔ اُدھر سازوسامان اور ڈویژنوں کا لشکر تھا، اِدھر انفرادی جذبہ تھا۔ یہ جنگ دراصل مورال اور میٹریل کی تھی۔ پاک فوج کے جذبے کو دس کروڑ شہریوں کی قوت حاصل تھی۔

یہ تجزیہ کچھ لمبا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میں سینکڑوں، ہزاروں میں سے صرف دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں جس سے واضح ہو جائے گا کہ پوری قوم کی قوت اگلے مورچوں تک کس طرح پہنچی تھی۔ میں خود حیران تھا کہ آخر وہ جذبہ کتنا قوی تھا جس کے زور پر انسانوں کے جسموں نے ٹینکوں کو روک کر بھسم کر ڈالا، اور ایک ساتھی کی لاش دیکھ کر ڈرنے کی بجائے ہمارے جیالے جانباز جذبۂ شہادت سے سرشار ہو گئے اور ایک دوسرے کے پیچھے شہید اور شدید زخمی ہوتے چلے گئے۔ میں گزشتہ دو برس سے فوج کے افسروں اور سپاہیوں سے مل رہا ہوں اور ان سے پوچھتا پھر رہا ہوں کہ مجھ پر وہ جذبہ واضح کریں۔ مجھے کئی طرح کے جواب ملے جن میں دو تین آپ بھی سن لیجئے۔

نارووال سیکٹر کے ایک توپچی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُس سے توپیں کرار والا سوال پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اَن پڑھ سپاہی ہے۔ فلسفی یا ماہرِ نفسیات نہیں۔ اُس نے ایک واقعہ سنا کر اپنے جذبے کی وضاحت کی۔ کہنے لگا کہ وہ بڑی گن (دو سو پونڈر) کا توپچی ہے۔ یہ گنیں بہت پیچھے نصب ہوتی ہیں جس طرح لاہور کی "رانی" شہر سے فائر کرتی رہی تھی۔ اس توپچی کی توپ نارووال سیکٹر کے کسی گاؤں سے دو اڑھائی فرلانگ دور نصب تھی۔ ایک روز پاکستان کی ایک جواں سال دیہاتی بیٹی سر پر چنگیر اور سالن کا پیالہ اٹھائے اس توپ کے پاس جا پہنچی اور بولی — "ویرو! لو روٹی کھا لو" — اس توپ پر چھ سات توپچی تھے۔ گن کسی ٹارگٹ پر فائر کر رہی تھی۔

ذرا سی دیر بعد فائر روکنے کا حکم مل گیا۔ ان توپچیوں نے اس عورت سے کہا کہ بہن! ہمیں راشن مل جاتا ہے۔ تم آئندہ یہاں نہ آنا۔ کوئی پتہ نہیں ہم پر کس وقت ہوائی حملہ ہو جائے۔ لیکن وہ بہن یوں چپ رہی جیسے اُسے دکھ ہوا ہو کہ اُسے توپ کے قریب جانے سے روکا گیا ہے۔ توپچیوں نے کھانا کھا لیا۔ اس توپچی نے مجھے بتایا کہ میں نے ازراہِ مذاق اپنے ساتھی سے کہا کہ "یار! لسی پیئے عرصہ ہو گیا ہے"! انہوں نے کھانا کھا لیا۔ اور وہ بہن چلی گئی۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد شاید دشمن کے ہوائی دیدبان P. O. AIR نے اس توپ کی پوزیشن دیکھ لی اور اپنے توپخانے کو نشاندہی کر دی۔ چنانچہ اس ایک توپ پر دشمن کے توپخانے کی گولہ باری شروع ہو گئی۔ یہ گولہ باری کوئی ایک میل کے علاقے کو زد میں لئے ہوئے تھی۔ ہر سو گرد اور سیاہ دھواں پھیل گیا اور دھماکوں سے زمین و آسمان لرزنے لگے۔

توپچی نے مجھے بتایا کہ میں نے جانے کیوں پیچھے دیکھا تو مجھے گرد و غبار میں کوئی آدمی جھاڑیوں کی اوٹ میں رینگتا دکھائی دیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ کسی دوسری توپ یا کسی انفنٹری کا سپاہی ہوگا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے کپڑے خاکی نہیں تھے۔ ذرا سی دیر میں میں نے پہچان لیا کہ وہ آدمی نہیں کوئی عورت تھی۔ جو گولوں سے بچنے کے لئے پیٹ کے بل رینگ رہی تھی۔ میں بھاگ کر پہنچا۔ میں اُسے پناہ میں لے لینا چاہتا تھا۔ قریب جا کر دیکھا تو میں حیران رہ گیا کیونکہ یہ وہی عورت تھی جو ہمیں کھانا کھلا گئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں لسی سے بھری ہوئی مٹی کی ڈولی تھی جسے وہ آگے دھکیلتی تھی اور رینگتی تھی، پھر اُسے دھکیلتی اور رینگتی تھی۔ وہ برستی آگ میں ہمارے لئے لسی لا رہی تھی — مجھے یاد آیا کہ میں نے ہی مذاق میں کہہ دیا تھا کہ لسی پیئے عرصہ ہو گیا ہے۔

توپچی بتاتا ہے کہ میں نے بڑے غصے سے اُسے کہا "پاگل! یہیں لیٹی رہو" — اور میں خود اُس کے سامنے بیٹھ گیا تاکہ سامنے سے جو گولے آئے وہ مجھے لگے، یہ بہن محفوظ رہے۔

اس تو پچی نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "آپ ہی بتائیے صاحب! ہم ان بہنوں کے نام پر کیوں نہ کٹ مرتے؟"

کھیم کرن قصور محور کے ایک حوالدار نے سنایا کہ پہلے روز ہماری پلٹن ڈھیلاتے ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچی تو میں اپنی پلاٹون کے ساتھ ایک گاؤں کے قریب سے گزرا۔ گاؤں کے لوگ باہر کھڑے تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ انہوں نے نعرے لگائے۔ بعض نے ہم سے ہاتھ ملائے اور بڑوں نے ہماری پیٹھ تھپکائی۔ عورتوں نے دوپٹے پھیلا کر ہماری سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی۔ "ویرو! تہاڈی جیہڑی کنڈ اساں ویکھی اے، اوہ ویری نہ ویکھے" — "بھائیو! تمہاری جو پیٹھ ہم نے دیکھی ہے وہ دشمن نہ دیکھے"۔

حوالدار سناتا ہے کہ گاؤں سے ذرا آگے چند جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ جب ہمارے سپاہی اُن کے قریب سے گزرے تو تین چار لڑکیوں نے اپنے دوپٹے اتار کر سپاہیوں پر پھینک دیئے اور ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر اپنا دوپٹہ ایک سپاہی کی پیٹھ پر باندھ دیا۔

"اللہ کی قسم!" حوالدار نے کہا۔ "پھر کچھ یاد نہ رہا کہ ہمارا مقابلہ ٹینکوں سے ہے یا توپوں سے۔ نہ یہ یاد رہا کہ دشمن کی نفری کتنی زیادہ اور ہم کتنے تھوڑے ہیں۔ ہم نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے دوپٹے کھیم کرن سے آگے پہنچا دیئے۔ ان میں سے میرے دو سپاہی شہید ہوتے تھے۔ میں نے ان کی لاشیں دیکھیں، دونوں نے اُن لڑکیوں کے دوپٹے اپنی فولادی ٹوپیوں پر لپیٹے ہوئے تھے۔"

ان دوپٹوں کا کرشمہ معمولی نہیں۔ ذرا یہ بھی سن لیجیے کہ کھیم کرن قصور سیکٹر میں دشمن کی قوت کیا تھی — ایک ماؤنٹین ڈویژن (نمبر ۴)۔ ایک ماؤنٹین بریگیڈ (نمبر ۱۴) اور نمبر ۲ انڈی پنڈنٹ آرمرڈ (بکتر بند) بریگیڈ گروپ جس کی نفری ڈویژن جتنی تھی۔ یہ ٹینکوں کا گروپ تھا۔ ان کی پشت پناہی کے لئے دو توپ خانے بریگیڈ تھے۔ ایک ہیوی (HEAVY) اور ایک میڈیم ہیوی۔ اس ہیبت ناک قوت کے اوپر انڈین ایئر فورس کے طیاروں کا آتشیں چھاتہ تھا — کھیم کرن کے دفاعی مورچے چھپے اور جوڑیاں کی طرح لوہے اور سیمنٹ کے بنکر تھے۔ ایک غیر ملکی وقائع نگار نے کھیم کرن کی فتح کے بعد ان بنکروں کو دیکھ کر کہا تھا — "جو فوج ان مضبوط مورچوں سے بھاگ گئی ہے وہ فوج کہلانے کی مستحق نہیں"۔

اس ہیبت ناک قوت کو ہمارے صرف ایک پیادہ بریگیڈ اور دو ٹینک یونٹوں نے شکست دے کر کھیم کرن فتح کیا تھا۔ حملے کے دوران ان ٹینک یونٹوں کے چوبیس ٹینک یہاں سے ہٹا کر سیالکوٹ سیکٹر میں بھیج دیئے گئے تھے۔ یعنی اپنی قوت اور زیادہ کم ہو گئی تھی۔

کھیم کرن کی فتح میں ایک اور شہری قوت کارفرما تھی۔ وہ تھے "معاشرے کے خطرناک ترین انسان" —

عادی قاتل اور ڈاکو جو لاہور جیل میں لمبی لمبی سزائیں بھگت رہے تھے ۔۔ کھیم کرن کے راستے میں چھوٹی چھوٹی نہریں اور رکھتے تھے جو گولہ باری سے ٹوٹ کر دلدل پھیلا رہے تھے۔ اس سے پیش قدمی رک رہی تھی رات کے وقت دو دو اور تین تین سو قیدی کسی پہرے کے بغیر جیل سے نکل کر میدانِ جنگ میں آجاتے تھے اور وہ نہروں اور کھتوں کے ٹوٹے ہوئے کنارے مرمت کرتے تھے۔ ان کے لئے طویل قید سے بھاگ جانے کا یہ بڑا اچھا موقعہ تھا۔ لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ بعض اوقات ان قیدیوں پر گولہ باری ہونے لگتی تھی تو فوج کے کمانڈر انہیں پیچھے چلے جانے کو کہتے تھے۔ لیکن قیدی ہر بار یہی جواب دیتے تھے کہ تم اپنا کام کرو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ اس گولہ باری میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ ہمیں اپنے حصے کا خون بہا لینے دو۔

ایک رات تین سو قیدی میدانِ جنگ میں اسی کام میں مصروف تھے کہ قیامت کی گولہ باری ہونے لگی قیدی بے بس ہو کر بکھر گئے۔ صبح کے وقت تین سو قیدیوں میں سے ڈیڑھ سو قیدی اکٹھے کئے جا سکے۔ اور انہیں جیل میں واپس لے آئے۔ خیال تھا کہ باقی یا تو زخمی ہو گئے ہیں یا قید سے مفرور ہو گئے ہیں۔ لیکن دن کے بارہ بجے تک جیل میں قیدیوں کی گنتی پوری ہو گئی۔ جو قیدی محاذ پر بکھر گئے تھے وہ فرداً فرداً اتنی دور سے پیدل چل کر واپس جیل میں آگئے۔ ان میں چند ایک زخمی بھی تھے۔

جنرل چوہدری جنگ کی اسکیم بناتے وقت پاکستان کی اس قوت کو بھول گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پچھلے مورچوں میں پاک فوج ہوگی ۔۔ لیکن وہاں دس کروڑ شہری تھے جو پاک فوج کے لئے ایسی قوت بن گئے تھے کہ انڈین آرمی کے اکیس ڈویژن پاکستان کی سرحد پر ذلت کی موت مر گئے ۔۔ اس فوج کو ۔۔ خدا کے اس ان گنت لشکر کو، نہ تو جنرل چودھری کی آنکھ دیکھ سکی تھی اور نہ ہی ٹائمز کے وقائع نگار کی نگاہ بھانپ سکی ۔۔ اور اس فوج کو دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکی۔

جہاد
جہاد
جہاد

نقطۂ پرکارِ حیات ۔۔۔۔ یعنی جہاد!
کے قرآنی تصور کے متعلق پرویز صاحب کی
گراں بہا تصنیف
مختصر لیکن بڑی جامع ، بصیرت افروز حقیقت کشا
قیمت :۔ صرف دو روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

رابطۂ باہمی

(بزمہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں)

بزمِ لاہور

بزم بدستور انہاک سے اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہے۔ ارکان کے پندرہ روزہ اجتماعات میں تحریک کے فروغ کے مختلف پہلوؤں پر قابلِ غور تجاویز سامنے آرہی ہیں۔ بزم کے باہمی رابطہ کے سلسلے میں ۱۴ اگست (یوم آزادی) کو بعد نماز مغرب ادارہ میں چراغاں ہوا اور ایک نہایت شگفتہ مجلس ' عشائیہ منعقد کی گئی جس میں پنجابی زبان کے مایہ ناز شاعر محترم سلطان محمود آشفتہ صاحب نے اس انقلاب آفریں دن کے شایانِ شان کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ مسلسل درس قرآن اب اُنتیسویں پارے میں سورۃ المزمل تک آچکا ہے جوں جوں یہ سلسلہ ختم قرآن کی طرف بڑھ رہا ہے، قرآن کی معجز نما تعلیم مرکوز ہوکر سامعین کے لئے فردوس گوش بن رہی ہے۔

بزمِ کراچی

شدید بارش اور دیگر موانعات کے باوجود بزم نے اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے حتی الامکان جدوجہد جاری رکھی۔ اور کارکردگی کی ہفتہ وار رپورٹیں ادارے کو بھیجتی رہی۔ سندھ اسمبلی ہال میں پرویز صاحب کا ٹیپ شدہ درس قرآن اب سورۃ القمر تک پہنچ چکا ہے۔ اس ہفتہ وار اجتماع کو زیادہ مقبول بنانے کے لئے بزم ان کے متعلق اطلاعات مقامی روزناموں کے علاوہ ریڈیو پاکستان کو بھی بھیج رہی ہے جس کے نتائج امید افزا ہیں۔ دعوتِ قرآن کی نشرواشاعت کے سلسلے میں بزم کی طرف سے متعدد سائن بورڈ بنواکر لگانے کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالےٰ ان ارکان کے ارادوں اور کوششوں میں برکت عطا فرمائے۔

بزمِ لائلپور

مفکرِ قرآن کے ٹیپ شدہ ہفتہ وار درسِ قرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ تحریک کے لٹریچر کی اشاعت بذریعہ ارکانِ بزم و مقامی ایجنسی ہائے کتب ہو رہی ہے۔ بزم کی لائبریری میں مزید کتب مہیا کرنے سے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بزمِ بریڈفورڈ (انگلستان)

محترم دین محمد صاحب نمائندہ بزم انگلستان اور ان کے رفقائے کار بڑے ذوق وانہماک سے تحریک کے فروغ کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کی کارکردگی کی رپورٹ جو انہوں نے اپنے حالیہ خط کے ساتھ ارسال فرمائی ہے حسب ذیل ہے:۔

ویسے تو بزم انگلستان کے ماہانہ اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن اس مرتبہ بزم کا سالانہ اجتماع ۱۸ اگست کی صبح کو رائل ہوٹل پریسٹن (PRESTON) میں زیر اہتمام مقامی ارکان محترم راجہ عبدالرزاق صاحب، خواجہ محمد عارف صاحب و دیگر احباب، شایانِ شان طور پر منعقد کیا گیا۔ دعوتِ قرآن کے شیدائی قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کے ساتھ جلسہ گاہ میں اکٹھے ہوئے۔ برمنگھم (BIRMINGHAM) نوٹنگھم (NOTTINGHAM) بریڈ فورڈ (BRADFORD) آکسفورڈ (OXFORD) لیڈز (LEEDS) اور کئی دیگر مقامات سے احباب نے شرکت کی۔ صدر جلسہ محترم راجہ عبدالرزاق صاحب نے قرآنی دعوت انقلاب کا تعارف کرایا جس کے بعد محترم پرویز صاحب کا ٹیپ شدہ خطاب "ہم ذلیل کیوں ہیں" شروع ہوا۔ مفکر قرآن کے خطاب کی دلنشینی اور ضرب کاری تھی جس سے پورا ایوان وجد و انہماک کے عالم میں جھوم رہا تھا اور ہال کے گوشہ گوشہ سے بے ساختہ تحسین و آفریں کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ اجلاس کے بارے میں دعوت نامے احباب کو پیشتر ارسال کئے گئے تھے۔ محترم رشید احمد صاحب (بریڈ فورڈ والے) نے طلوع اسلام کی تصانیف کا سٹال بھی ہال کے ایک طرف لگا رکھا تھا۔ پرویز صاحب کے خطاب کے بعد احباب اس انقلاب آفریں لٹریچر کی طرف بڑھے اور بڑے شوق سے اپنے نوجوانوں اور دوستوں کے لئے کتب خرید فرمائیں۔

اس کے بعد کا اجلاس شام چھ بجے ختم ہوا۔ چاء و کھانے کے بعد بزم انگلستان کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں محترم محمد یوسف علی صاحب نے تجویز پیش کی کہ انگلستان میں مجلہ طلوع اسلام کی اشاعت بڑھائی جائے اور اس کے متعلق رسالہ میں اشتہار دیا جائے کہ جو لوگ فکر قرآنی سے دلچسپی رکھتے ہوں اور ماہانہ رسالہ خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں اُن میں سے کم از کم پانچ احباب کو بزم کی طرف سے ایک سال کے لئے ماہنامہ جاری کیا جائے۔ اس تجویز پر سب احباب نے لبیک کہا۔ محترم رحمٰن صاحب نے ایک خدشہ کا اظہار فرمایا کہ پاکستان سے کافی نوجوان انگلستان میں آچکے ہیں جو قرآنی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ بزم کے ارکان کا یہ فرض ہے کہ وہ طلوع اسلام کے لٹریچر کے ذریعے ان نوجوانوں تک قرآن کی صحیح تعلیم پہنچائیں ورنہ خدشہ ہے کہ یہ بچے عیسائیت کو اپنا مذہب بنالیں گے۔ اس سلسلہ میں محترم رشید احمد بٹ صاحب نے تجویز پیش کی کہ طلوع اسلام میں بچوں کے صفحہ سے ماخوذ کر کے کافی تعداد میں پمفلٹس شائع کئے جائیں اور ان نوجوانوں کو بلاقیمت مہیا کئے جائیں۔ یہ کام ہر رکن اپنے گردوپیش میں کرے اور ان پمفلٹس کے علاوہ اور پمفلٹس بھی تحریک کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے شائع کئے جائیں۔ موخرالذکر تجویز کے محرک نوٹنگھم (NOTTINGHAM) سے محترم محمد اکبر صاحب تھے ——— ایک تجویز طلوع اسلام کے متعلق اشتہارات اخباروں اور بسوں (BUSES) میں دیئے جانے کے متعلق بھی پیش ہو کر منظور ہوئی۔ رات کے دس بجے جب احباب ایک دوسرے سے مل کر رخصت ہونے لگے تو اس موقع پر تحریک کی کامیابی کے لئے نیز محترم پرویز صاحب کی درازیٔ عمر کے لئے دعا مانگی گئی اور میزبانوں نے مہمانوں کو بڑے تپاک سے الوداع کہا۔

دیگر بزمیں

بزہائے راولپنڈی، ملتان، سرگودھا، مردان، گجرات، ہنگو، پنڈدادن خان، دلیہ منڈی، میانوالی وغیرہ پیامِ قرآن اور تحریک طلوع اسلام کے فروغ و اشاعت میں انہماک سے کام کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام مخلص اور بے لوث کارکنان کو جزائے خیر دے اور ان کے نیک ارادوں اور عزائم میں استقامت عطا کرے۔

بزم جلالپور جٹاں

بزم نے محترم ڈاکٹر محمد اکرم صاحب کو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ ادارہ اس بزم کی تجدید کی توثیق کرتا ہے۔ اس کی ابتدا کرتے ہوئے محترم مرزا غلام حسین صاحب نے اپنی فیکٹری (برٹش فین کمپنی گجرات) کا تیار کردہ نہایت خوبصورت پیڈسٹل فین، لاہور کے درسِ قرآن کے لئے تحفۃً مرحمت فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کی مساعی کو مشکور فرمائے۔

لغاتُ القرآن

کے نام سے آپ اسے قرآنی الفاظ کی ڈکشنری نہ سمجھیں۔ اگر آپ اس کا بغور مطالعہ فرمائیں گے تو آپ قرآن کی تفسیر سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ یہ سارے قرآن کی تعلیم اور تصورات کو نکھار کر سامنے لے آتی ہے حسین ٹائپ میں چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے قیمت پہلی تین جلدیں۔ فی جلد پندرہ روپے۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ پورے سیٹ کی قیمت پچاس روپے علاوہ محصولڈاک۔

ناظم ادارہ

انسان نے کیا سوچا؟

گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں، دنیا کے عظیم مفکرین، مؤرخین، اور سائنس دانوں نے زندگی کے اہم مسائل حل کرنے کے لئے کیا سوچا۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

یہ کتاب نہیں، علم و تحقیق کا انسائیکلوپیڈیا ہے

طباعت نہایت حسین، مجلد کی قیمت بارہ روپے

ناظم ادارہ

پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

کراچی۔ سندھ اسمبلی ہال۔ نزد سعید منزل بندر روڈ۔ ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے۔

لاہور۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے۔

ملتان۔ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ ہر جمعہ۔ بعد نماز مغرب

لائلپور۔ پنجاب ڈیریز۔ ۸۰/۱۰۔ اے پیپلز کالونی ہر جمعہ بعد نماز مغرب

سرگودھا۔ ۲۵۔ نیو سول لائن۔ کوارٹر ۳ ہر اتوار۔ ۶ بجے شام

لیہ۔ متصل ہوٹل۔ نزد ریلوے اسٹیشن ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ

انگلستان۔ بزم طلوع اسلام۔ ۷۰ سالٹ سٹریٹ بریڈفورڈ ۸ کے زیر اہتمام یہ درس ہر اتوار کی صبح دس بجے نشر ہوتا ہے۔ بریڈفورڈ سے باہر رہنے والے احباب نمائندہ بزم کو مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھ کر ٹیپ بھی منگوا سکتے ہیں۔

راولپنڈی۔ الکوثر بلڈنگ۔ متصل زنانہ کالج۔ مری روڈ۔ ہر جمعہ ۴ بجے شام

سیہین (ضلع جہلم) برمکان سید محمد حسین شاہ صاحب ہر اتوار ـــــ

(درس کے وقت کا پتہ نمائندہ مذکور سے حاصل کریں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جہاد

پرویز صاحب کی ایک تقریر جو ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ سے تین ماہ پیشتر کی گئی تھی!

برادرانِ عزیز! مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں جہاد کے عنوان پر قرآن کریم کی روشنی میں آپ احباب سے خطاب کروں۔ جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا۔ ایمان اُس مقصد کو متعین کرتا

جہاد کے معنی

ہے جو مومن کا منتہائے نگاہ قرار پاتا ہے۔ اور عملِ صالح اُس جدوجہد کا نام ہے جو اس مقصد کے حصول کے لئے کی جائے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اسلام اور جہاد، اور مومن اور مجاہد مترادف الفاظ ہیں۔ اسلام نام ہی یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا ہے۔ اور اسی کو جہاد کہا جاتا ہے — یعنی مسلسل حرکت۔ پیہم سعی و عمل، لگاتار کوشش، مدام جدوجہد — اور اسی کا دوسرا نام زندگی بھی ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے ہنگامِ حیات
ہے یہی اے بے خبر! رازِ دوامِ زندگی

بلکہ یہ کہ — زندگی جہد است و استحقاق نیست — یعنی زندگی یونہی بیٹھے بٹھائے بطورِ حق کے نہیں مل جاتی۔ اسے مسلسل سعی و عمل اور پیہم کد و کاوش سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ — يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ..... (۸/۲۴) اے جماعتِ مومنین! تم خدا اور رسولؐ کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے۔ اور اس امتیاز کو انسانی زندگی کے ہر گوشے میں اور ہر قدم پر یہ کہہ کر نمایاں کر دیا کہ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ ....

وَالْمُجٰهِدُوْنَ - جدوجہد کرنے والے اور بیٹھے رہنے والے کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (۴/۹۵) خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے، جدوجہد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر بڑی فضیلت حاصل ہوتی ہے اور ان کے لئے اجرِ عظیم ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، جہاد زندگی کے ہر گوشے میں مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ لیکن اس جدوجہد کا آخری گوشہ وہ ہوتا ہے جہاں ایک مردِ مومن، اپنے بلند و بالا مقصد کے حصول کے لئے سرکف میدانِ جنگ میں نکل آتا ہے۔ اس مرحلہ کے لئے قرآن کریم نے قتال کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

قتال

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو جہاد میں قتال بھی شامل ہوتا ہے لیکن قتال، جہاد کے ایک اور آخری گوشے کا نام ہے۔ یا یوں کہئے کہ قتال، جہاد کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے جس موضوع کے متعلق مجھ سے خطاب کے لئے کہا گیا ہے اس سے مراد، جہاد کا یہی آخری گوشہ، یعنی قتال ہی ہے۔ اس لئے میری معروضات بھی سردست اسی گوشہ تک محدود رہیں گی۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

امن و سلامتی کا دین

اسلام، امن و سلامتی عطا کرنے والا نظامِ زندگی ہے۔ (خود لفظ اسلام کے مفہوم میں یہ حقیقت داخل ہے) خدا کا ایک نام "السلام" اور دوسرا "المومن" ہے۔ المومن کے معنے ہیں امن عالم کا ذمہ دار۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مومن بھی خدا کی اسی صفت کا آئینہ دار ہے۔ سب سے پہلا عہد مومن خود رسول ہوتا ہے۔ اس لئے حضورؐ کے متعلق فرمایا کہ وہ رسولِ امین تھے (خدا کا ہر رسول امین ہوتا تھا) اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو جماعتِ مومنین کا اولین فریضہ دنیا میں امن قائم کرنا اور اسے برقرار رکھنا ہے۔ اس امت کی بعثت کے متعلق کہا گیا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ (۳/۱۱۰) تم وہ بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے اٹھا کھڑا کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نوعِ انسان کی بھلائی میں امن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اگر دنیا میں امن ہی قائم نہ رہے تو بھلائی کا امکان کہاں ہوگا۔ امن کی ضد فساد ہے اور فساد کو خدا نے انسانیت کی عدالت میں سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ مفسدین اسکے نزدیک بدترین مجرم ہیں۔ فساد میں انسانی جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور انسانی جان کی قیمت اس کے نزدیک اتنی بڑی ہے کہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یاد رکھو! جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا، یوں سمجھو کہ اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی۔ (۵/۳۲)

اس سے ظاہر ہے کہ جماعتِ مومنین خود امن میں رہے گی اور دوسروں کے امن میں کبھی خلل انداز

نہیں ہوگی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب دنیا کی سرکش اور مستبد قوتیں، امنِ عالم میں خلل انداز ہوں تو اس سلسلہ میں جماعتِ مومنین پر کوئی فریضہ عاید ہوتا ہے یا نہیں؟ کیا ایسی صورت میں انہیں خاموشی سے بیٹھے "یاد اللہ" میں مصروف رہنا چاہیئے یا کچھ اور کرنا چاہیئے؟ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ امنِ عالم کا قائم رکھنا خدا کی ذمہ داری ہے۔

فساد لیکن انسانی دنیا میں خدا اپنی ذمہ داریاں خود انسانوں کے ہاتھوں سے پوری کرایا کرتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر اس نے کہا ہے کہ

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (۲/۲۵۱)

اگر خدا سرکش اور مستبد قوتوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں سے نہ کرائے تو دنیا میں فساد برپا ہو جائے۔

اور فساد کی تشریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲/۴۰)

اگر خدا مستبد قوتوں کی روک تھام دوسری جماعتوں سے نہ کراتا رہتا تو دنیا سے مذہبی آزادی ختم ہو جاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ) مختلف اہلِ مذاہب کی پرستش گاہیں۔ یہودیوں کے صومعے، عیسائیوں کے گرجے، راہبوں کی کوٹھڑیاں، مسلمانوں کی مسجدیں جن میں خدا کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہتی۔ سب ایک دوسرے کے ہاتھوں منہدم ہو جاتیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رو سے مذہبی آزادی کو کسقدر اہمیت حاصل ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے خدا کیا انتظام کرتا ہے۔ بہرحال، ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، امنِ عالم برقرار رکھنے کی خدا کی ذمہ داری یوں پوری ہوتی ہے کہ جب کوئی قوم جو نشۂ قوت سے بدمست ہو، دوسروں کے امن میں خلل انداز ہو، تو اس کی روک تھام دوسری جماعتوں کے ہاتھوں سے کرائی جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ دوسری جماعت، جماعتِ مومنین کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ یہی وہ جماعت ہے جو انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسی لئے مندرجہ بالا آیت کے آخر میں فرمایا کہ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (۲۲/۴۰) — جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا کا قانون اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اسے ایسا کرنا بھی چاہیئے اسی لئے اس نے کہا ہے کہ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰/۴۷) جماعتِ مومنین کی مدد کرنا ہم پر لازم ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ سرکش اور مستبد قوتوں کی روک تھام کس طرح کی جائے گی؟ اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ جب یہ دیکھا جائے کہ ان کی روک تھام کے لئے تمام مصالحانہ تدبیریں ناکام ہو چکی ہیں اور یہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے تیار ہی نہیں تو پھر اس کے سوا چارۂ کار ہی کیا رہ جاتا ہے کہ ان کی روک تھام قوت سے کی جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے قرآن کریم نے کہا کہ۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ۔ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل اور ضوابط قانون دے کر بھیجا اور میزانِ عدل بھی۔ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ تاکہ لوگ عدل کو قائم رکھ سکیں۔ اس کے بعد ہے۔ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ ان کے ساتھ ہم نے فولاد (شمشیر خارہ شگاف) بھی نازل کیا جس میں بڑی سختی ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے بے شمار فائدے۔ یہ کیوں نازل کی گئی؟ اسی مقصد کے لئے جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ یعنی خدا کی مدد کرنے کے لئے۔ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ کون خدا اور اس کے رسولوں کی ایسے مراحل میں مدد کرتا ہے جن میں انسان کو ہر قسم کی مشکلات اور مصائب برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ اور ان کے نتائج ہنوز نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

اس سے دنیا کے سامنے یہ حقیقت آجاتی ہے کہ خدا کا یہ نظام کس قدر غلبہ اور قوت کا مالک ہے!

آپ نے غور کیا کہ اس مقام پر اسلام، مذاہب کی دنیا سے الگ ہو کر کس طرح ایک عملی نظامِ زندگی (دین) کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ دنیائے مذاہب میں ایسے مقام پر کہا جائے گا کہ جب سرکش قوتیں ظلم و زیادتی پر اتر آئیں تو خدا پرست انسان کو چاہیئے کہ وہ ان مظالم کو صبر اور سکون سے برداشت کرے۔ وہ اگر ایک گال پر طمانچہ ماریں تو دوسرا گال ان کے سامنے کر دیں۔ لیکن اسلام تو نظامِ حیات ہے وہ دنیا میں عملاً رہنا اور اس کا امن قائم رکھنا سکھاتا ہے۔ اس کے لئے اس نے کہا کہ جس خدا نے دلائل و براہین اور ضوابطِ قانون نازل کئے ہیں، اسی نے ان کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی نازل کی ہے اور ان دونوں کے مجموعے سے دین ترتیب پاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
اس بیت کا یہ مصرعِ اولیٰ ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

شمشیر کا نزول

تلوار اور قرآن

یہ اس بیت کا مصرعِ اولیٰ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا دوسرا مصرع کیا ہے جس

کے ساتھ مل کر یہ مصرعِ اول، مکمل شعر بنتا ہے ؛ اس کے لئے انہوں نے جاوید نامہ میں کہا ہے کہ ۔ مومناں را تیغ با قرآں بس است ۔ یعنی قرآن اور تلوار، دونوں مل کر نظامِ زندگی کا مکمل شعر بنتے ہیں۔ اوران کی کیفیت یہ ہے کہ ۔

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

تلوار (قوت) قرآن کی حفاظت کرتی ہے کہ سرکش اور بے باک قوتیں، اس ضابطۂ زندگی کو عاجز و ناتواں بناکر، دین کو مذہب، میں تبدیل نہ کردیں اور اس طرح خود من مانی کرنے لگ جائیں۔ اور قرآن تلوار کی حفاظت کے لئے ہے کہ اسے صرف اس مقام پر استعمال کیا جائے جہاں قانونِ خداوندی اس کی اجازت دے۔ اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں قرآن، تلوار کے استعمال کی اجازت دیتا ہے، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔

یہ واضح ہے کہ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جو ایک آزاد خطۂ زمین ہی میں متشکل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ یہ خطۂ زمین، ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہے، کہ اگر یہی محفوظ نہ رہا تو جماعتِ مومنین خود ہی امن میں نہیں رہ سکے گی، چہ جائے کہ وہ امنِ عالم کے قیام کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اس مملکت کی سرحدوں کو مضبوط رکھا جائے اور ہر خطرے کے مقابلہ کے لئے پوری پوری تیاری کی جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے۔

اپنی سرحدوں کی حفاظت

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (۸/۶۰)

اُن کی روک تھام کے لئے تم امکان بھر قوت فراہم کرو۔ حفاظت کے لئے اپنی سرحدوں پر فوجی چھاؤنیاں قائم کرو۔ تاکہ اس سے تمہارے اور نظامِ خداوندی کے دشمنوں کے دل میں تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔ اِن دشمنوں کے علاوہ، ان دشمنوں کے دلوں میں بھی جنہیں ابھی تم نہیں جانتے لیکن خدا کو انکا علم ہے ؛

اس لئے کہ جب تک کسی ملک کی سرحدیں مضبوط اور محکم نہیں ہوں گی، وہ ملک محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ اور جب ملک ہی محفوظ نہیں ہوگا تو اس کا نظام کس طرح محفوظ اور برقرار رہ سکے گا ؟

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے ؎ اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

پھول کی حفاظت کے لئے کانٹوں کا وجود ضروری ہے۔ لیکن ان کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ ان کا مقصد پھول کی حفاظت ہے، نہ کہ خواہ مخواہ راہ چلتوں کے دامن کو الجھانا اور ان کے ہاتھوں کو زخمی کرنا۔

یہ تو رہیں حفاظتی تدابیر، اگر سرکش قوتیں ان تدابیر کے باوجود، آگے بڑھتی چلی آئیں تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا جواب ظاہر ہے۔ لیکن اس جواب کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر کا سامنے لانا ضروری ہے جس میں یہ جواب دیا گیا تھا۔ نبی اکرمؐ — اور آپ کے رفقاء کی مختصر سی جماعت نے تیرہ برس تک مکہ میں ہر قسم کے مظالم برداشت کئے اور بالآخر اپنا گھر بار، خویش و اقارب، اسباب و متاع چھوڑ کر مدینہ چلے آئے۔ لیکن ان مخالفین نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور ایک لشکر جرار لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ اس مقام پر خدا کی طرف سے یہ وحی نازل

جنگ کی اجازت

ہوئی کہ — اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا۔ یہ لوگ، جن پر اس قدر ظلم و زیادتی کی جا رہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ یہ بھی میدانِ جنگ میں اتر آئیں۔ اس کے سوا اب کوئی اور چارۂ کار ہی نہیں۔ اور چونکہ یہ ظلم اور زیادتی کی روک تھام کے لئے میدانِ جنگ میں آئیں گے اس لئے وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔ خدا ان کی مدد کرے گا۔ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ۔ (۲۲/۳۹) یہ وہ مظلوم ہیں جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا، صرف اس جرم کی پاداش میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ۔ جو لوگ تم سے جنگ کرنے کے لئے یوں امنڈ آئے ہیں، تم ان سے جنگ کر سکتے ہو۔ لیکن تمہاری یہ جنگ فی سبیل اللہ ہوگی۔ یعنی حق و صداقت کی حفاظت کی خاطر، نوعِ انسانی کی بھلائی کی خاطر، امنِ عالم برقرار رکھنے کی خاطر، دنیا سے ظلم و استبداد مٹانے کی خاطر۔ اور اس کے بعد ہے۔ وَ لَا تَعْتَدُوْا۔ (۲/۱۹۰) — تم ان کے خلاف جنگ تو کر سکتے ہو لیکن حد سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ظلم اور زیادتی نہیں کر سکتے۔ جوشِ انتقام میں حدود فراموش نہیں ہو سکتے۔ دشمن سے بھی عدل کرنے کی، جو تاکید خدا نے کی ہے تم اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔

آپ نے دیکھا کہ جہاں تلوار، قرآن کی حفاظت کے لئے اٹھ رہی تھی، وہیں تلوار کی حفاظت کے لئے قرآن آگے بڑھ آیا۔ اور اسے کہہ دیا کہ تم اس حد تک جا سکتی ہو، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تلوار کے اس حد تک جانے کا مقصد کیا ہے؟ وہی جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی وَ قَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔ (۸/۳۹)۔ تم ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، فساد مٹ جائے یعنی دین کا معاملہ صرف اللہ کے لئے رہ جائے۔ اس میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔

یہاں تک معاملہ اپنی حفاظت کے لئے جنگ کرنے کا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ جماعت اس لئے وجود میں لائی گئی تھی کہ یہ خود محفوظ رہے اور بس! کیا ان کا وجود مقصود بالذات تھا یا کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ یہ جماعت پیدا اس لئے کی گئی تھی کہ یہ ظلم اور زیادتی کی روک تھام کرے۔ یہ امن عالم کے برقرار رکھنے کی ذمہ دار قرار دی گئی تھی۔ اس لئے انہیں المؤمن کہا گیا تھا۔ اگر آپ اس ایک نکتہ پر غور کریں گے تو آپ کو "اسلامی قومیت" اور عام دنیاوی قومیت کا فرق نمایاں طور پر نظر آجائیگا۔ دنیا کی ہر قوم

اقوام میں فرق

اپنے لئے جیتی ہے۔ اس کا مقصد زندگی اپنے آپ کو محفوظ اور مستحکم رکھ کر اپنے لئے زیادہ سے زیادہ قوت، دولت، ثروت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن امت مسلمہ دنیا میں اس لئے زندہ رہتی ہے کہ وہ ہر مظلوم، کمزور، ناتوان کی حفاظت کا موجب ہے۔ اس کا مقصد، خود تیر کر ساحل تک پہنچ جانا نہیں ہوتا، ڈوبنے والوں کو بچانا بھی ہوتا ہے۔ اسی کا نام "جہاد فی سبیل اللہ" ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ فی سبیل اللہ جنگ کرتے ہیں اور دوسری قومیں فی سبیل الطاغوت جنگ کرتی ہیں (۴/۷۶) لہٰذا دنیا میں کہیں سے بھی مظلوم مدد کے لئے پکارے — اور وہ کوئی بھی ہو — ان کا فریضہ ہے کہ یہ اس کی مدد کو پہنچیں۔ یہ ہے وہ مقام جہاں انہیں "جنگ" کی "اجازت" نہیں بلکہ جنگ کی تاکید کی جاتی ہے۔ سورۃ نساء میں دیکھئے، کیسے بلیغ اور مؤثر انداز میں اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لایا گیا ہے۔ فرمایا۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ

جنگ کی تاکید

فِي سَبِيلِ اللّٰهِ - اے جماعت مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے؟ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا۔ تم سنتے نہیں ہو کہ کمزور و ناتواں مظلوم و مقہور، مرد، عورت، بچے کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمارے لئے اس بستی سے نکلنے کا کوئی سامان پیدا کر دے جس کے رہنے والے اس قدر ظلم اور زیادتی پر اتر آئے ہیں۔ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (۴/۷۵) ہمارا کوئی والی وارث اور حامی و ناصر نہیں۔ تو اپنی طرف سے کسی کو ہمارا والی اور مددگار بنا کر بھیج، تاکہ وہ ہمیں اس ظلم و تعدی سے نجات دلائے۔

آپ اس حقیقت پر غور کیجئے کہ یہ مظلوم و ناتواں، خدا کو مدد کے لئے پکار رہے ہیں۔ اور خدا اس جماعت مومنین سے کہہ رہا ہے کہ تم سنتے نہیں کہ وہ کس طرح ہمیں مدد کے لئے پکار رہے ہیں! تم ان کی مدد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ یہ وہی حقیقت ہے جسے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانی ہاتھوں سے پوری ہوتی ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں سے یہ خدائی ذمہ داریاں پوری ہوتی ہیں انہیں خدا نے حزب اللہ (خدا کی

پارٹی) کہہ کر پکارا ہے اور ان کے مخالفین کو حزب الشیطان (۵۸-۲۲) ۔ اور اس عظیم حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ جب ان دونوں پارٹیوں کا مقابلہ ہوگا تو خدا کی پارٹی ہمیشہ غالب رہے گی۔

اسلامی جنگیں

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اسلام میں جنگ مدافعانہ (DEFENSIVE) ہوتی ہے یا محاربانہ (OFFENSIVE) اور مخالف اور موافق گوشوں سے اس سوال کے عجیب و غریب جوابات دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اسکا جواب بالکل واضح ہے۔ اسلام میں جنگ مدافعانہ ہوتی ہے۔

لیکن اس مدافعت کا تصور عام دنیاوی تصور سے ذرا مختلف ہے۔ عام دنیاوی تصور یہ ہے کہ جو جنگ اپنی حفاظت کے لئے لڑی جائے اسے مدافعانہ کہا جائے گا۔ لیکن قرآن کی رو سے جو جنگ ظالم کی روک تھام اور مظلوم کی مدافعت کے لئے کی جائے۔ خواہ وہ مظلوم کہیں ہو اور کوئی ہو، اسے مدافعانہ کہا جائے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اسلام کی ہر جنگ مدافعانہ ہوگی۔ یعنی دنیا میں ظلم اور زیادتی کی روک تھام کے لئے اگر جنگ کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو وہ جنگ محاربانہ ہے اور اسلام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

تاریخ اُمم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
مقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے خدا کی یہ پارٹی، اللہ کا یہ لشکر ہر وقت مستعد رہتا ہے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جب کوئی شخص ایمان لاکر مومن بنتا ہے تو یہ ایمان درحقیقت خدا اور بندے کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔

خدا اور بندے کا معاہدہ

اس معاہدہ کی رو سے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ مومن اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ اور اگلی دنیا میں بھی جنتی زندگی ــــ لیکن یہ معاہدہ محض کاغذی کارروائی نہیں ہوتی کہ لفظی طور پر کہہ دیا جائے کہ ہم نے اپنا جان و مال خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہے اور اس کے عوض جنت مل جائے۔ یہ معاہدہ عملاً اس طرح پورا ہوتا ہے کہ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ۔ (۹:۱۱۱) وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور لوٹتے ہیں اور یا اپنی جان دے دیتے ہیں۔ یوں اس معاہدہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

جب ایسا وقت آجائے تو پھر دنیا کا کوئی "نیک کام" درجہ اور افضلیت میں، اس (جہاد) کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ "نیک کام" (اعمالِ صالح) اس امر کے مظہر ہوتے ہیں کہ انسان خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کا تحفظ چاہتا ہے۔ ان اقدار کے تحفظ کا طریق یہ ہے کہ جب ان میں اور طبعی زندگی کے کسی مفاد میں تصادم ہو، تو ان اقدار کو محفوظ رکھا جائے اور طبعی مفادات کو قربان کر دیا جائے۔ ان طبعی مفادات میں، انسان کی اپنی جان کی حفاظت سب سے زیادہ گراں ہوتی ہے۔ انسان ہر قیمت پر اپنی جان بچانا چاہتا ہے۔ لیکن جب انسان کی جان اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ ہو تو اس وقت جان دے کر ان اقدار کی حفاظت کر لینا بہت بڑی قربانی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا نیک عمل اور کونسا ہو سکتا ہے؟ اسی لئے

جہاد کی فضیلت

فرمایا ہے کہ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی پینے کی سبیلیں لگا دینا اور مسجدِ حرام کی تعمیر اور آبادکاری اور تزئین و آرائش کے کام کرنا، اللہ اور آخرت پر ایمان لا کر اس کے راستے میں جہاد کرنے کے برابر ہو سکتے ہیں؟ تم اپنے ذہن سے کچھ ہی فیصلہ کیوں نہ کر لو، حقیقت یہ ہے کہ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ۔ میزانِ خداوندی میں ان دونوں کا وزن کبھی یکساں نہیں ہو سکتا۔ ایسا سمجھنا ظلم ہے۔ یعنی کسی شے کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنا۔ اور وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو ایسا کرتا ہے اس پر کامیابی کی راہیں کشادہ نہیں ہوتیں۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ۔ جو لوگ ایمان لانے کے بعد ہجرت کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں، اللہ کے نزدیک ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حقیقی معنوں میں کامیاب و کامران کہا جا سکتا ہے۔ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۔ (۹/۱۹-۲۲) ان کا نشوونما دینے والا انہیں رحمت و رضوان و جنت کی بشارت دیتا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے نزدیک ان کا اجر بہت بڑا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جب جہاد کا وقت آجائے تو پھر وہ بڑے سے بڑا کام جسے ہم اپنی دانست میں بڑے ہی اجر اور ثواب کا موجب سمجھتے ہوں، جہاد کے مقابلہ میں کس قدر بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

(اقبالؔ)

اس وادیٔ عشق و مستی میں جان دینا تو خیر بعد کی بات ہے، یہاں تو مجاہدین کے قدم قدم پر نیکیاں پاؤں چومتی

ہیں۔ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ۔ یہ مجاہدین بھوک اور پیاس کی جس شدت کو جھیلتے ہیں، جو تکان اور مشقت اٹھاتے ہیں، ان کا ہر وہ قدم جو اس مقام پر پڑتا ہے جہاں اس کا پڑنا دشمن کے لئے غیظ و غضب کا موجب ہو۔ حتیٰ کہ ہر وہ نقصان جو انہیں فریقِ مخالف کی طرف سے پہنچتا ہو، ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عملِ صالح بنتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا حسنِ کارانہ عمل ضائع نہیں ہونے دیتا وَ لَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَّ لَا كَبِيرَةً وَّ لَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۹/۱۲۰) اور یہ لوگ اس مقصد کے لئے جو کچھ بھی صرف کرتے ہیں۔ خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت، یا جو منزل بھی وہ قطع کرتے ہیں، یہ سب ساتھ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں، تاکہ خدا کا قانون انہیں ان کے اعمال کا حسین ترین صلہ دے۔

خدا کے دست و بازو ان مجاہدین کے مدارجِ بلند کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جو کچھ یہ میدانِ جنگ میں کرتے ہیں انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ تم انہیں (دشمنوں کو) قتل نہیں کر رہے تھے۔ خدا قتل کر رہا تھا۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (۸/۱۷) تو تیر نہیں چلا رہا تھا۔ خدا خود تیر چلا رہا تھا۔ تلواریں تمہاری تھیں، ہاتھ ہمارے تھے۔ تیر تمہارے تھے، کمانیں ہماری تھیں۔ یہ مجاہد ہیں جو خدا کے دست و بازو بنتے ہیں اس لئے کہ یہ خدا کی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے سربکف اور کفن بدوش میدان میں نکل آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیتا ہے کہ ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز

شہید مردہ نہیں اس آویزشِ حق و باطل میں جو سعادت مند افراد اپنی جان دے دیں ان کے متعلق کہا کہ انہیں مردہ مت کہو۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ۔ جو خدا کی راہ میں جان دے دیں انہیں مردہ مت کہو۔ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُونَ۔ (۲/۱۵۴) یہ مردہ نہیں زندہ ہیں۔ لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اُس زندگی کی کنہ و حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ۔ (۳/۱۶۹) خدا کی راہ میں جان دینے والوں کے متعلق خیال تک بھی نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں۔ وہ

اپنے نشو ونما دینے والے کے ہاں زندہ ہیں۔ وہ انہیں سامانِ حیات عطا کرتا ہے۔

کھول کے کیا بیاں کروں سِرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ با شرف، مرگ حیاتِ بے شرف

یہی ہیں وہ بلند بخت، سعادت مند افراد جنہیں عُرفِ عام میں شہید کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ جان دے کر اپنے ایمان کی زندہ شہادت پیش کرتے ہیں۔ یہ نظامِ خداوندی کے مبنی برحق و صداقت ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ اس فریضے کی ادائیگی کو تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں جس کی رُو سے امتِ مسلمہ کو شہداء علی الناس کہا گیا ہے۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کے اعمالِ حیات کی محاسب و نگران۔ کتنا اہم تھا یہ فریضہ، اور کس حسن و خوبی سے انہوں نے اسے ادا کیا۔ سے

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی!

یہ تو پھر بھی خود صاحبین کی شہادت کا تذکرہ ہے، قرآن کریم تو مجاہدین کے گھوڑوں کی تگ و تاز کو بھی حق و صداقت کے لئے بطورِ شہادت پیش کرتا ہے جب کہتا ہے کہ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا. فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا. (۱۰۰:۱-۵) شہادت دیتے ہیں وہ گھوڑے جو ہانپتے ہوئے یورش کرتے ہیں۔ جو پتھروں پر اس شدت سے پاؤں مارتے ہیں کہ ان سے آگ کی چنگاریاں نکلتی ہیں۔ جو صبح سویرے دشمن کی فوجوں پر حملہ کرتے ہیں، جن کے سموں کی تاپ سے گرد و غبار اُڑتا ہے۔ جو مردانہ وار دشمن کی صفوں کے اندر جا گھستے ہیں۔ یہ سب شہادت دیتے ہیں اس حقیقت کی کہ جب انسان وحی کی روشنی میں قدم نہ اٹھائے تو یہ بڑا ہی ناقدر شناس ہو جاتا ہے اور دنیا میں فساد برپا کرتا ہے جسے روکنے کے لئے مجاہدین کے گھوڑوں کو اس طرح یورش کرنی پڑتی ہے۔

یہ تو ہیں مجاہدین کے سرفروشانہ کارنامے۔ اس شہادت گہِ الفت کے معاملات کس قدر نازک ہیں؟ اس کا

پیٹھ موڑنے والا

اندازہ قرآن میں بیان کردہ ایک اور حقیقت سے لگائیے۔ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ بدر کا میدان ہے۔ مومنین کی مٹھی بھر جماعت اپنا سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی راہ میں جان دینے کے لئے دشمن کے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ یہ صحابہ کبارؓ کی جماعت ہے۔ یہ ان السابقون الاولون کی

---

[1] ان آیات کا ایک اور مفہوم بھی ہوسکتا ہے جسے میں مفہوم القرآن میں بیان کروں گا۔ (پرویز)

جماعت ہے جنہیں خدا نے مومن حقا کہہ کر پکارا ہے۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ میدانِ جنگ میں یہ دشمن کی صفوں پر برقِ خاطف بن کر گرنے کے لئے ایسے مضطرب و بے قرار کھڑے ہیں کہ سینہ شمشیر سے باہر ہے دمِ شمشیر کا۔ عین اس وقت ان سے کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھنا۔ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ (۸/۱۶) آج کے دن ان میں سے جو شخص دشمن کو پیٹھ دکھائے گا، بجز اس کے کہ وہ میدان میں پینترہ بدلنے کے لئے ہو یا اپنی جماعت کیساتھ ملنے کے لئے، تو یاد رکھو۔ وہ خدا کے غضب کا مستحق ہو جائے گا اور سیدھا جہنم میں چلا جائے گا۔ اور تم جانتے ہو کہ جہنم کس قدر بُرا ٹھکانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جماعت میں کون ایسا ہو سکتا تھا جو دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلتا! یہ تاکید میدانِ جہاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے، ہمارے آپ کے لئے ہے۔

یہ ہے جہاد کی عظمت اور اہمیت قرآن کریم کی رو سے۔ جہاد سے بڑھ کر کوئی اور حسنِ عمل نہیں اور اس سے گریز کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ یہی ماحصلِ دین ہے، یہی منتہائے ایمان ہے یہی متاعِ حیات ہے ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

اب ظاہر ہے کہ اگر اس کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی اور کشش زیادہ جاذب ہو جائے تو پھر ایمان باقی کہاں رہ سکتا ہے۔ دیکھئے! قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو کس قدر واشگاف انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ قُلْ۔ اے رسول! ان سے برملا کہہ دو۔ کہ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ

جہاد کی اہمیت

وَعَشِيْرَتُكُمْ ـــ اگر تمہارے ماں باپ، تمہارے بیٹے بیٹیاں، تمہارے بہن بھائی تمہاری بیویاں، تمہارے دیگر افرادِ خاندان ـــ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا تمہارا مال و دولت جسے تم محنت و مشقت سے کماتے ہو۔ وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا۔ یا تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم اس قدر خائف رہتے ہو۔ وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ۔ یہ تمہارے مکانات اور محلات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں ـــ یاد رکھو! ان میں سے کوئی چیز اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ ـــ تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ فَتَرَبَّصُوْا۔ تو تم انتظار کرو۔ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔ تا آنکہ خدا کا فیصلہ تمہارے خلاف آجائے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (۹/۲۴)

ایسی قوم جو سیدھی راہ کو چھوڑ کر، غلط راہوں پر چل نکلے، اسے کامیابی کی راہ کس طرح دکھائی دے سکتی ہے!

یہ ہے برادرانِ عزیز! جہاد سے گریز کرنے والی قوم کا مآل اور انجام!

جنگ کے سلسلہ میں قرآن کریم کس قسم کے احکام اور ہدایات دیتا ہے — معاہدات کا احترام کس قدر ضروری ہے۔ دشمن کے ساتھ صلح کرنے کی کس قدر تاکید ہے۔ دشمن کے معاملہ میں بھی عدل اور انصاف کے اصولوں پر کاربند رہنا کس قدر ضروری ہے۔ جو تمہاری پناہ میں آجائے اسے کس طرح اپنی حفاظت میں، اس کے مامن تک پہنچانا چاہیئے۔ جنگ کے قیدیوں کو فدیہ لے کر یا بطور احسان چھوڑ دینا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ — یہ موضوع الگ ہے جس کی طرف میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کریم کن حالات میں جنگ کی اجازت دیتا ہے اور کن حالات میں اس کی تاکید کرتا ہے۔ جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے،

(۱) اُس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے جنگ کی اجازت ہے جو نظامِ خداوندی کی عملی تشکیل کا ذریعہ ہو۔ اور

(۲) ظلم و استبداد کی روک تھام کے لئے جنگ کی تاکید ہے، وہ خواہ کہیں بھی ہو، مظلوم کی آواز پر لبیک کہنا مسلمان کا اولین فریضہ ہے۔

موجودہ حالات ان حقائق کی روشنی میں اب ان حالات پر غور کیجئے جو ہندوستان کی طرف سے گزشتہ سترہ اٹھارہ برس میں مسلسل اور پیہم پیدا کئے جا رہے تھے۔ اور جو اب اپنی انتہا تک پہنچ چکے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان میں ہنوز، قرآنی نظام قائم نہیں ہوا۔ لیکن اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ یہاں نظامِ خداوندی قائم کیا جائے۔ یہی پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد تھی اور اسی بنیاد پر ہمارے دعوے کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اسی کے لئے ہم نے اسے حاصل کیا تھا اور یہی ہمارا منتہیٰ و مقصود ہے۔ جس طرح ایک مقصد اور منتہیٰ کی حفاظت ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح اس مقصد کے حصول کے ذرائع کی حفاظت بھی ضروری ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک خطۂ زمین ہے جسے "مسجد" بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہے تو مسجد کہاں تعمیر ہو سکے گی۔ سرزمین پاکستان کی مثال اس وقت بالکل وہی ہے جو ہجرتِ نبویؐ کے فوری بعد سرزمینِ مدینہ کی تھی کہ وہاں ہنوز نظامِ خداوندی متشکل نہیں ہوا تھا لیکن وہ اس نظام کی تشکیل کا ذریعہ بننے والی تھی۔ لہٰذا، برادرانِ عزیز! میری بصیرت قرآنی

کے مطابق، سرزمین پاکستان کی حفاظت ہمارے لئے جزوِ ایمان ہے۔ ہندو نے پہلے دن سے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی۔ اور اس کی مخالفت کے علی الرغم وجود میں آگیا۔ وجود میں تو یہ آگیا لیکن ہندو نے اسے دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ اس کی شدید آرزو یہ ہے کہ (خدانہ کردہ) اس کے جداگانہ "آزاد" وجود کو ختم کرکے، اسے پھر سے بھارت کا جزو بنا لیا جائے۔ اس کے لئے وہ مسلسل مصروفِ کوشش ہے۔ اور اب اس مسئلہ کو اس نے انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

جہاں تک ظلم اور زیادتی کا تعلق ہے، گزشتہ اٹھارہ برس میں، ہندوستان نے، وہاں کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ صرف اس جرم کی پاداش میں، کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ — وہ خدا کو اپنا رب کیوں مانتے ہیں۔ وہ مظلوم و ناتواں، پکار پکار کر خدا سے کہتے ہیں کہ ہماری مدد کے لئے کسی کو بھیج۔ ان حالات میں مسلمانوں پر فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ ہندوؤں کے اس ظلم و ستم کی روک تھام کریں۔

ہندوستان سے جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ہماری حکومت کا ہے۔ وہ حالات کے مطابق جو فیصلہ بھی کرے وہی فیصلہ درست ہوگا۔ لیکن اگر وہ جنگ کرنے کا فیصلہ کرے، تو یہ جنگ یقیناً جہاد فی سبیل

جہاد فی سبیل اللہ

اللہ ہوگی۔ اور اس میں جان دینا شہادت۔ موجودہ عسکری نظام کے مطابق میدانِ جنگ میں فوجیں ہی جاتی ہیں، ہر ایک نہیں جا سکتا۔ لیکن شہری آبادی بھی اس جہاد میں برابر کا حصہ لے سکتی ہے۔ قرآن کریم نے مال اور جان دونوں سے جہاد کا حکم دیا ہے۔ اگر ہمارے سپاہی (یا قومی رضاکار) جان سے جہاد کرنے کے لئے نکلتے ہیں تو شہری آبادی کے لئے مال سے جہاد کرنا لازم آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں فوج کی کامیابی کا انحصار خود شہری آبادی کے (MORALE) پر ہوتا ہے۔ شہری آبادی جس قدر ہمت اور استقلال کا ثبوت دے گی اور جس قدر امن و سکون سے رہے گی فوج کے لئے کامیابی حاصل کرنا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔ ملک کے لئے دشمن کا حملہ اس قدر پریشان کن نہیں ہوتا جس قدر پریشان کن اور مصائب آفریں، شہری آبادی کا انتشار اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ کی جو دو خصوصیات بیان کی ہیں کہ — اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ — تو ان کا مظاہرہ زمانۂ امن کے مقابلہ میں زمانۂ جنگ میں اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے — فوج اگر اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ — کا مظاہرہ کرتی ہے تو شہری آبادی کو رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی مظہر ہونا چاہیئے۔ یعنی تمام باہمی اختلافات اور تنازعات کو یکسر بالائے طاق رکھ کر، کامل محبت اور یک جہتی سے پُرسکون رہنا اور نہایت ہمت اور استقلال سے تمام مشکلات کا مقابلہ کرنا۔ شہری آبادی اس جہاد میں اسی انداز سے حصہ

سے سکتی ہے۔ انہی کے لئے کہا گیا ہے کہ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (۸:۴۶) باہمی جھگڑے مت پیدا کرو۔ ایسا کرو گے تو تم بزدل بن جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ لہٰذا تم استقامت اور ثبات سے رہو۔ یاد رکھو۔ خدا ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

فوج کے پاس اگر سامانِ حرب و ضرب کی کمی بھی ہو تو مقصد کی صداقت اور ان کا یقینِ محکم اس کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ ان میں کا ایک ایک مجاہد دشمن کے دس دس سپاہیوں پر غالب آسکتا ہے (۸:۶۵)۔۔۔ اور اپنے سے دوگنی فوج پر تو یہ بہر حال غالب رہتے ہیں۔ (۸:۶۶) یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال رحؒ نے کہا ہے کہ ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مومن کی قوت

یعنی زندگی کے بلند و بالا مقاصد پر یقین نہ رکھنے والے کی قوت اس کے سامان و اسباب تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن ان مقاصد و اقدار پر ایمان رکھنے والے کے پاس ایک اور قوت بھی ہوتی ہے۔ یعنی صداقت پر مر مٹنے کی شدتِ آرزو، جسے قوتِ ایمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ قوت بے پناہ ہوتی ہے۔ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہی قوتِ ایمانی، غیر محاریب (شہری) آبادی کے دل میں وہ [illegible] سا ہمت پیدا کر سکتی ہے جس سے ہر مشکل کا مقابلہ نہایت ثبات و استقامت سے ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ فریضہ جو موجودہ حالات میں ہم (اہلِ پاکستان) پر عائد ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اس فریضہ کی ادائیگی میں ذرا سی بھی کوتاہی کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے بھی قرآنِ کریم کے الفاظ میں سن لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۸:۲۵)

اس تباہی سے بچو کہ جب وہ آجائے تو پھر انہی تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی ہو۔ اس کے شعلے سارے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے

ہیں، اور پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

ذکر را منزلت باشد نہ مدرا!

اور یہ خدا کے اس قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتا ہے جس کا تعلق انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ سے ہے اور یہ قانون اپنی گرفت کے لحاظ سے بڑا شدید واقع ہوا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

یہ ہے برادرانِ عزیز! فطرت کا اٹل اصول۔ اس کی رُو سے، زندہ وہی رہ سکتا ہے جو مرنا جانتا ہے۔ اس کے بغیر انسان کا ہر دعوےٰ باطل اور ہر اعتقاد جھوٹا ہوتا ہے ؎

یہ جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا، وہ عشق یداللّٰہی

مجھے یقین ہے کہ وقت آنے پر ہم اس امتحان میں پورے اتریں گے۔ خوش بخت ہیں وہ افراد جنہیں ایسے مواقع میسر آجائیں جن میں جنت انہیں پکار پکار کر بلا رہی ہو اور خدا کی رحمت ان کی طرف ہجوم کر کے آ رہی ہو!

عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۔ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ!

[پرویز صاحب نے یہ تقریر جون ۱۹۶۵ء میں کی اور اس کے تین ہی ماہ بعد وہ خطرہ سچ مچ سامنے آگیا، جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا۔ بھارت نے پاکستان پر شب خون مارا۔ لیکن ہماری افواجِ قاہرہ کے جیالے نوجوانوں نے تیرہ سو سال پہلے کی ہماری تاریخ کی یاد تازہ کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ہماری شہری آبادی نے جس ضبط و تحمل، سکون و اطمینان، ہمت و حوصلہ، کشادہ نگہی، اور وسعتِ ظرفی کا ثبوت دیا اس کی نظیر بھی کم ہی ملے گی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمیں ایسی کامیابی حاصل ہوئی جس نے اقوامِ عالم میں ہمارا سر بہت اونچا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سر کو ہمیشہ اونچا رکھے۔　طلوعِ اسلام]

پاکستان کا معمارِ اول
"سرسیدؒ"
ادارہ طلوعِ اسلام کی تازہ ترین پیشکش — عنقریب شائع ہو رہی ہے!

اِن کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہمارے جیوش و عساکر نے جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے، ان کے متعلق اسی زمانے میں، ملک میں عجیب وغریب قسم کے افسانے مشہور ہونے شروع ہو گئے تھے۔ چونکہ اس قسم کی خواب آور توہم پرستیوں کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے، اس لئے طلوعِ اسلام نے اس کی تردید ضروری سمجھی، اور مندرجہ بالا عنوان کے تحت، دو اشاعتوں میں حقیقت کو واضح الفاظ میں پیش کیا۔ ان میں پہلے عہدِ رسالتمآب کے جنگی کارناموں کو سامنے لا کر بتایا گیا کہ وہ کارنامے، جنہوں نے دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا تھا، انسانوں ہی کے دست و بازو کے رہینِ منت تھے۔ اس کے بعد لکھا گیا تھا۔

"ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ انسانوں کی دنیا میں کوئی مافوق الفطرت قوت کام نہیں کرتی۔ مافوق الفطرت قوت کا تصور یوں پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ باہمت انسان کر گزرتے ہیں، بے ہمت انسان اسے اپنے بس کی بات نہیں سمجھتا۔ اس لئے وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتا ہے کہ اُس (باہمت) انسان کو کوئی فوق الفطرت قوت حاصل تھی جس کی وجہ سے اُس نے ایسا محیر العقول کارنامہ کر دکھایا۔ اس جھوٹی تسلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی کوشش ہی نہیں کرتا کہ خود بھی باہمت بن کر اسی جیسے کارنامے کر دکھائے۔ اور جب کوئی قوم بے ہمت ہو جاتی تو وہ اپنے ماضی کے تابندہ کارناموں کے متعلق بھی یہی ذہنیت پیدا کر لیتی ہے کہ اُن لوگوں کو خدا کی طرف سے فوق الفطرت قوتیں حاصل تھیں جس کی وجہ سے وہ ایسا کر گزرے۔ ہمیں نہ وہ قوتیں حاصل ہیں، نہ ہی ہم وہ کچھ کر سکتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ تاریخ کی وہی داستانیں جنہیں قوم کے لئے مضرابِ عمل بننا تھا، نیند آور لوریاں بن جاتی ہیں۔"

"ہم انہی خواب آور لوریوں میں مست تھے کہ ہندو پاکستان کی حالیہ (ستمبر ۱۹۶۵ء کی) جنگ میں، ہمارے جیوش و عساکر نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ہمارے اسلاف نے جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے تھے،

وہ ان کے مقصد کی صداقت، ان کے یقینِ محکم، عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند کا نتیجہ تھا۔ اس میں کوئی فوق الفطرت عنصر کارفرما نہیں تھا۔ اس لئے جو لوگ بھی اسی انداز کے یقینِ محکم، عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند سے کام لیں گے، ان سے اسی قسم کے حیرت انگیز کارنامے سرزد ہو جائیں گے۔ چونکہ ان سپاہیوں کے ساتھ ہماری "روحانی عقیدتمندیاں" وابستہ نہیں ۔۔۔ ہم اٹھارہ برس سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ ہمارے ہی جیسے انسان ہیں ۔۔۔ اس لئے ان کی حق پرستی، فرائض شناسی، جاں سپاری، خود سپردگی، ہمت، شجاعت، لیاقت، استقامت کے کارنامے ہمارے لئے مثال بن سکتے ہیں ۔۔۔ اور یہ اس جنگ کا بڑا ہی خوشگوار پہلو ہے۔ اس نے ہماری غلط نگہی کو دور کر کے حقائق بینی سکھا دی ہے۔ اس نے ہماری تاریخ میں ایک نئے درخشندہ باب کا اضافہ کیا ہے۔

لیکن ہم بڑے افسوس سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کے ان کارناموں کو بھی فوق الفطرت توہم پرستیوں کی چادروں میں لپیٹا جا رہا ہے۔ کہیں یہ مشہور کیا جا رہا ہے کہ ایک ہندو پائیلٹ نے (جو ہمارا قیدی ہے) ۔۔۔ بتایا کہ جب ہم پاکستان کی فوجوں پر اوپر سے گولہ پھینکتے تھے تو ہم دیکھتے تھے کہ نیچے ایک سفید ریش، سبز پیرہن بزرگ کھڑے ہیں اور وہ ہمارے گولوں کو، کرکٹ کی گیند کی طرح ہاتھوں میں دبوچ کر، دوسری طرف پھینک دیتے ہیں۔ کہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ جب سکھ سپاہی قید ہو کر آئے تو انہوں نے پاکستانی فوج کو بڑی حیرت سے دیکھا اور کہا کہ وہ فوج کہاں ہے جو ہمارے سامنے میدانِ جنگ میں لڑتی تھی؟ جب ان سے کہا گیا کہ وہ فوج یہی ہے تو انہوں نے سر ہلا کر کہا کہ نہیں صاحب! وہ تو سفید نورانی لباس میں ملبوس، گھوڑ سواروں کی فوج تھی جن کے جسم پر کوئی گولی اثر نہیں کرتی تھی۔ ہم نے تو انہی کے خوف سے ہتھیار رکھ دیئے تھے۔ تم تو وہ نہیں ہو! یہ اور اسی قسم کے افسانے، دن رات وضع کئے اور ملک میں پھیلائے جا رہے ہیں اور سادہ لوح عوام خوش ہیں کہ ہماری کس طرح "غیب سے امداد" ہوئی۔

آپ نے غور فرمایا کہ جیوش و عساکر کا ذوقِ یقین اور عملِ آہن گداز، ہمارے جانباز فضائیہ کی بے پناہ جرأتیں، لاہور اور سیالکوٹ کے قابلِ فخر پاسبانوں کی بے مثال قربانیاں، چودہ چودہ دن تک خندقوں میں بیٹھ کر چنے کی ایک مٹھی پر گذارہ کر کے، آگ اور خون کے سیلابِ بلا انگیز کو روکنے والے مردانِ کارزار کی تحیر انگیز استقامت ان کے یہ تمام درخشندہ کارنامے جن پر خود تاریخ فخر کرے گی، کس طرح تصوراتی سبز پوشوں اور توہماتی گھوڑ سواروں کی گرد میں گم ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔۔۔ اور یہ کچھ ابھی سے شروع ہو گیا ہے جب جنگ ہنوز ختم بھی نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان پر جو کچھ گزرے گی ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حالانکہ یہ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جب واہگہ کی سرحد پر دشمن نے اچانک یلغار کر دی تھی اور ہنوز ہماری فوجیں وہاں نہیں پہنچی تھیں تو انہوں نے ان تمام گاؤں کو تباہ و برباد کر دیا۔ وہاں کی ہنستی آبادی کو

تیغ کے گھاٹ اتار دیا، ہماری عزت و ناموس کو ٹرکوں میں بھر کرلے گئے۔ اس وقت ان مظلوموں کی غیبی امداد نہ ہوئی ۔ کسی سبز پیرہن یا سفید پوش نے انہیں دشمن کی دستبرد سے نہ بچایا۔ لیکن جب ہماری فوج وہاں جا پہنچی تو سترہ دن تک دشمن نے ہر ممکن کوشش کر دیکھی اور وہ ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے اور یوں اہلِ لاہور کی جان، مال، عزت، آبرو، محفوظ رہی۔ یہ سب کچھ ان جاں فروشوں کے عزم و ہمت کے تصدق ہوا۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے لیکن اس کے باوجود وہ افسانے ہیں کہ پھیلتے جا رہے ہیں۔

بظاہر نظر آتا ہے کہ توہم پرستیوں کے یہ تانے بانے عوام (جہلا) کی عقیدت مندیوں کے بُنے ہوئے ہیں لیکن ذرا سا غور کرنے سے اس کے نیچے حقیقت کچھ اور نظر آئے گی۔ ہمارے اربابِ محراب و منبر اور اصحابِ سبحہ و مصلّے نے اپنے لئے معاشرہ میں جو مقام از خود پیدا کر رکھا ہے، زمانۂ امن میں اس کا کوئی حریف نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سوا ہر ایک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور حقارت کی نظروں سے ٹھکراتے رہتے ہیں۔ اور کوئی شخص اُن کے خلاف ایک لفظ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں تعظیم و تکریم کے تمام نذرانے، ان کی طرف سے منہ موڑ کر مردانِ کارزار کی بارگاہ میں پہنچنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لوگ "مُلّا کی اذاں" اور "مجاہد کی اذاں" میں فرق اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں؛ "مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست" اور "مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات" صاف الگ الگ دکھائی دینے لگ جاتے ہیں۔ اور ہر گوشے سے ان کی تعریف و توصیف کے غلغلے بلند ہونے لگتے ہیں ــــ یہ حضرات (اربابِ منبر و مصلّی) اس کے خوگر ہی نہیں ہوتے کہ اپنے حلقہ سے باہر کسی اور کی عزت و توقیر برداشت کر سکیں ــــ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ حضرات، صحابہؓ تک تو مجاہدین کے کارنامے بیان کرتے ہیں، کہ یہ ان کا شمار اپنے ہی حلقہ میں کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد، اس ہزار بارہ سو سال میں، کسی مردِ تیغ آزما کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا۔ ان کی تعریف و ستائش کے تمام زمزمے علماء و زہاد کے طبقہ تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا جب جنگ کے زمانے میں، اربابِ تیغ و سناں کی توصیف و تعریف کے چرچے عام ہو جاتے ہیں ــــ اور اربابِ تیغ و سناں بھی وہ (فوجی) جن میں یہ سلسل اٹھارہ برس تک کیڑے ڈالتے چلے آ رہے تھے ــــ تو یہ نگاہوں کا رُخ دوسری طرف پھیرنے کے لئے ایک بڑا لطیف حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ان کے محیّر العقول کارناموں کو، روحانی قوتوں" کی طرف منتقل کر دیا جائے تاکہ ان کا کوئی (CREDIT) ان جانبازوں کے حصے میں نہ آئے۔ تعریف و توصیف ہو تو آسمان سے اُترنے والے، سبز پوشوں اور سبز عماموں والوں کی، کیونکہ یہ کارنامے درحقیقت انہوں نے سرانجام دیئے تھے۔ اربابِ تیغ و علم تو محض ان کے آلۂ کار تھے۔ یعنی جس طرح کوئی شخص اس توپ کی تعریف نہیں کرتا جس کے گولوں نے دشمن کو تباہ کیا ہو، بلکہ توپچی کی تعریف کرتا ہے، اسی طرح، اصل تعریف کے مستحق یہ "آسمانی عناصر" قرار پا جاتے ہیں اور خاک و خون میں غلطیدہ سپاہی، اُن کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔

ان خیالات کو اس شد و مد سے پھیلایا جا رہا ہے کہ (اور تو اور) خود ہمارے یہ قابلِ فخر سپاہی بھی — جن کی قوتِ ایمانی اور جوشِ کردار نے یہ محیر العقول کارنامے کر کے دکھائے ہیں — یہ کہنے لگ گئے ہیں کہ صاحب! ہمیں خود معلوم نہیں کہ یہ کچھ کیسے ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ایسا کہنے میں اس کسر نفسی اور منکسر المزاجی کا بھی دخل ہے جو ایک بلند نگاہ، کشادہ ظرف، صاحبِ عزم و ہمت فاتح کا فطری شعار ہوتا ہے، لیکن ڈر یہ ہے کہ اگر یہ عقیدہ بن گیا کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں ان جواں ہمتوں کے دست و بازو کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ سب کارنامے مافوق الفطرت عناصر کے رہینِ منت ہیں۔ تو یہ قوم کی انتہائی بدقسمتی ہو گی۔ جنگ میں مالِ غنیمت و کشور کشائی، اتنی گراں بہا متاع نہیں ہوتی، جتنی بیش قیمت متاع خود آفرینی کی وہ دولت ہوتی ہے جو اس قوم کو میسر آ جاتی ہے — یعنی وہ قوم اپنے آپ کو منکشف (DISCOVER) کر لیتی ہے۔ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کو پہچان لیتی ہے۔ وہ جان لیتی ہے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کے تصور کا رُخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ یہ سب کچھ "آسمان سے اترنے والوں" نے کیا ہے، تو وہ اپنی نگاہوں سے بدستور اوجھل رہتی ہے اور آئندہ ایسے خطرات کے مواقع پر، اسی قسم کی "روحانی تائید" کے انتظار میں، بیٹھی، زندگی کے ہر شعبے میں شکست کھاتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے وہ خطرہ جس کے پیشِ نظر ہم نے قوم کے سامنے اس حقیقت کا پیش کرنا ضروری سمجھا ہے کہ جو کچھ اس جنگ میں ہوا ہے وہ تمہارے مقصد کی صداقت، تمہارے یقین کی محکمیت، تمہاری استقامت، تمہاری جرأت، تمہارے ایثار سے ہوا ہے۔ اس کا سہرا تمہارے سر ہے۔ تم نے یہ کچھ کیا ہے۔ تم پھر بھی یہ کچھ کر سکتے ہو۔ اسے یہ بتانا مقصود ہے کہ ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اس کے دل میں اس شعور کا بیدار کرنا مطلوب ہے کہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اسے اس امر کا یقین دلانا مقصود ہے کہ ؎

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

معلوم ہوا ہے کہ حکومت ان کارناموں کا، جو جنگ میں سامنے آئے ہیں، ریکارڈ مرتب کرنے کا ارادہ کرتی ہے،

یہ بڑا مبارک فیصلہ ہے۔ لیکن ہم حکومت سے گزارش کریں گے کہ

(۱) ان داستانوں کو براہ راست متعلقہ لوگوں سے جمع کیا جائے تاکہ یہ امکانی حد تک صحیح معلومات پر مشتمل ہوں۔

(۲) ان میں مبالغہ آمیز افسانوں کو دخیل نہ ہونے دیا جائے۔ نہ ہی انہیں کسی مافوق الفطرت عنصر کا نتیجہ قرار دیا جائے۔

(۳) انہیں اس انداز سے پیش کیا جائے کہ یہ بلند ہمت انسانوں کے کارناموں کی حیثیت سے سامنے آئیں اور قوم محسوس کر سکے کہ ہم میں کیا کچھ کر سکنے کی قوتیں پنہاں ہیں۔

(۴) اور اس حقیقت کو واضح انداز میں پیش کیا جائے کہ تائید ایزدی کسے کہتے ہیں اور یہ کسے حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ ریکارڈ موجودہ اور آنے والی نسلوں کے دل میں حیات بخش جذبات اور جرأت آفریں ولولے بیدار کرنے کے لئے مضراب کا کام دیں گے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ڈر ہے کہ قوم کے ان جاں نثاروں کا بے بہا خون، افسانوں کی سرخیاں بن کر رہ جائے گا۔ اور یوں یہ متاع گراں بہا ضائع ہو جائے گی۔"

اس کے بعد ہم نے، جنوری ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں اسی سلسلہ کی اگلی کڑی کو پیش کرتے ہوئے لکھا۔

ہم نے طلوع اسلام کے اکتوبر کے شمارہ میں لکھا تھا کہ حالیہ جنگ میں ہمارے قابل فخر مجاہدوں نے جو محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ ان کی پامردی، ہمت، شجاعت، استقامت، جانبازی اور جانفروشی کے زندہ مظاہرے ہیں۔ انہیں غیبی قوتوں کی طرف منسوب کر کے، انہیں افسانے نہ بنایئے۔ اس سے بڑا نقصان ہوگا۔ لیکن انسان کی اجوبہ پسندی کچھ ایسی واقعہ ہوئی ہے کہ اسے چیستاں سرائی اور داستاں گوئی سے ورے تسکین ہی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا تقاضا ہے کہ ان افسانہ تراشیوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ مثلاً ہفتہ وار معاصر، چٹان کی ۲۰ نومبر کی اشاعت میں حسب ذیل "مافوق الفطرت واقعات" درج ہیں۔

"ایک محاذ پر توپوں کے دہانے کھلے ہوئے تھے۔ بیسویں صدی کے بھارتی بھیڑیئے گولہ باری کر رہے تھے۔ پاکستانی مجاہد جوابی کارروائی میں مصروف تھے کہ ایک سفید ریش بزرگ سادہ دیہاتی لباس میں عین مورچہ پر تشریف لے آئے اور توپچی کو گولہ پھینکنے کے لئے نشان دہی کرنے لگے۔ آپ انگشت شہادت سے اشارہ کرتے کہ اس طرف گولہ پھینکا جائے۔ چنانچہ ان کے کہنے کے مطابق توپ کا زاویہ بدل دیا جاتا۔ اور عجب بات یہ ہے کہ گولہ ٹھیک ٹھیک نشانہ پر لگتا۔ جس کی وجہ سے دشمن کی صفوں میں نہ صرف ابتری پھیل جاتی، بلکہ اسکے بھارتی ٹینک اور توپیں بھی برباد و ناکارہ ہو جاتیں، اور آخر کار بھارتی سینا پسپائی پر مجبور ہو جاتے۔ ایک دن پاکستانی

میجر کو خیال آیا کہ یہ درویش کون ہیں جو روزانہ محاذ پر راہنمائی کرتے ہیں۔ دوسرے دن صبح بزرگ موصوف کو خیمہ میں بلایا گیا۔ اردلی افسر کا اشارہ پاتے ہی ایستادہ ہو گیا اور سفید ریش بزرگ سے استفسار کیا گیا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لاتے ہیں۔ درویش بزرگ نے کچھ جواب نہ دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پانی طلب کیا۔ اردلی پانی لینے گیا تو میجر کرسی پر بیٹھنے کے لئے بڑھا، جونہی توجہ دوسری طرف مبذول ہوئی تو میجر نے دیکھا وہ کرسی خالی پڑی ہے جس پر بزرگ تشریف فرما تھے۔ میجر اور تمام لوگ حیران تھے کہ یہ کیا کرشمہ ہے۔ تلاش بسیار کے بعد بھی وہ بزرگ پھر اس محاذ پر نظر نہ آئے۔

پھر تحریر ہے۔

ایک عزیز دوست شرقپور سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ کے دنوں ایک رات مجھے حضرت میاں شیر محمدؒ صاحب کی خواب میں زیارت ہوئی تو آپ کا لباس گرد آلود اور ہاتھ قدرے میلے تھے۔ میں نے پوچھا حضرت! اس وقت کونسی مصروفیت ہے تو آپ نے اشارۃً فرمایا کہ محاذ جہاد جاری ہے اور مجاہدین کی اعانت فرض ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے۔

ایک صاحب قصور کے رہنے والے ہیں اور ہر ہفتہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار مبارک پر حاضری دیا کرتے ہیں۔ وہ ایک دن حسب معمول مزار پر حاضر ہوئے تو کوشش بسیار کے باوجود صاحب مزار سے کوئی توجہ نہ مبذول سکی۔ اس پس و پیش کے عالم میں انہوں نے تین دن تک یہیں قیام کیا۔ آخری رات چند لمحات کے لئے زیارت ہوئی، تو حضرت داتا گنج بخشؒ نے فرمایا کہ محاذ پر مصروف تھا۔ سرکارِ دو جہان کے فرمان کے مطابق تمام بزرگانِ دین پاکستان کی سرحدوں پر متعین کئے گئے ہیں اور پاکستان کی حفاظت کے لئے جہاد کا حکم دے دیا گیا۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ :

روزنامہ حریت کراچی اور مشرق لاہور میں مدینہ منورہ سے ایک صاحب کا خط شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مکتوب نگار کو آنحضرتؐ کی زیارت ہوئی تو سرور کونینؐ حرم نبوی کے باب السلام میں بڑی عجلت میں پابرکاب ہیں آپ کے جلو میں صحابہ کرامؓ کا قافلہ بھی ہے۔ رسالتمآبؐ فرما رہے تھے کہ پاکستان پر کفار نے حملہ کر دیا ہے۔ اس لئے جہاد فرض ہو گیا اور سواری بڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔

اور اسی ردیف میں یہ بھی کہ :

حکیم نیر واسطی لاہور جنگ کے دنوں وطن عزیز سے باہر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ عمرہ کرنے کے بعد جب زیارت روضۂ اطہر کے لئے مدینہ منورہ پہنچا تو وہاں کے مشہور بزرگ حضرت مولانا عبدالغفور مہاجر مدنی نے دوران ملاقات فرمایا کہ ایک رات حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے خواب میں ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا۔ آپ نجف شریف سے کیسے

تشریف لے آئے تو فرمایا۔ پاکستان پر کفار حملہ آور ہیں۔ اس لئے وہاں جہاد میں شرکت کے لئے جا رہا ہوں۔

اس کے بعد ایک حلفیہ بیان درج ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

لاہور کی ایک جامع مسجد کے خطیب نے منبر رسولؐ پر کھڑے ہو کر حلفیہ بیان کیا کہ بھارتی فوجیوں اور ہوابازوں کو جب پاکستان کی بہادر افواج نے گرفتار کیا تو وہ حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ پاکستان کے وہ سبز پوش مجاہد کہاں ہیں۔ کہ ہم سخت سے سخت حملہ کرتے تھے لیکن وہ سبز پوش بڑے اطمینان سے ہمارے حملہ کو ناکارہ بنا دیتے اور ہمیں پسپائی پر مجبور کر دیتے۔

اور انتہا یہ کہ بھارتی ہوابازِ پاکستان کے ایک معروف شہر پر تقریباً سو بم گراتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے اس شہر کے ہوائی اڈے کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا تو یہ اللہ کی رحمت کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ان "واقعات و مشاہدات" کو درج کرنے کے بعد صاحب مضمون رقمطراز ہیں:۔

> الغرض ایسے لاتعداد واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ خود اللہ تعالیٰ نے لڑی ہے اور خالقِ کون و مکان کے محبوب پیغمبر سرورِ کائنات کے فیض و برکت سے فتح پذیر ہوئی ہے۔"

ہم ان حضرات سے باادب دیانت کرنے کی جرأت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی مخالف یہ اعتراض کر دے۔ کہ

> آپ کے عقیدہ کے مطابق یہ جنگ خود اللہ تعالیٰ نے لڑی ہے۔ اس میں حضور نبی اکرمؐ، حضرت علیؓ، داتا گنج بخشؒ، میاں شیر محمد شرقپوریؒ، اور دیگر اولیاء کرام، بہ نفس نفیس شریک ہوئے۔ اور سرکار دو جہاںؐ کے فرمان کے مطابق تمام بزرگانِ دین پاکستان کی سرحدوں پر متعین کئے گئے۔
>
> تو پھر یہ کیوں ہوا کہ قصور پر بمباری ہوئی اور وہاں کی بے گناہ بستی آبادی تباہ و برباد ہو گئی۔ پشاور کے گرد و نواح کے دیہات دشمن کی گولہ باری کا نشانہ بن گئے۔ مریدکے اور نارنگ کے قریب چلتی ٹرینوں کے مسافر بچارے بم سے اڑ گئے۔ اعوان شریف پر دشمن کے گولوں نے آگ برسا دی اور کتنا ہی نقصان ہو گیا۔ سیالکوٹ میں گولہ باری نے تباہی مچا دی۔ سلامت پورہ کی بستی گولوں کا نشانہ بن گئی۔ لاہور اور سیالکوٹ سیکٹر میں سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہمارا کتنا ہی علاقہ دشمن کے قبضہ میں چلا گیا۔

تو آپ کے پاس اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟ جو جنگ خود خدا لڑے، کیا اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے؟ اور آگے بڑھیئے۔ پاکستان نے یہ جنگ کشمیر کے مظلوموں کی حفاظت اور ان کے جائز حقوق کے استرداد کے لئے لڑی تھی۔ لیکن خود کشمیر میں دشمن نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اور جس طرح معصوم بچوں، بے گناہ عورتوں، مظلوم بوڑھوں، نہتے مسلمانوں کو بے دریغ قتل ہی نہیں کیا جا رہا بلکہ انہیں زندہ جلایا جا رہا ہے گاؤں کے گاؤں نذرِ آتش کئے جا رہے ہیں۔ عورتوں کی بے محابا عصمت دری کی جا رہی ہے۔ جو قتل ہونے سے بچ جاتے ہیں انہیں انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ملک بدر کر دیا جاتا ہے ـــ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ ذرا سوچئے کہ یہ اعتراض بڑی گہری سوچ کا متقاضی ہے۔

اسی مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ

> بعض غزواتِ اسلامیہ میں صحابہ کبارؓ نے رسول اللہؐ سے سوال کیا کہ میدانِ جنگ میں ایسے مجاہد بھی برسرِ پیکار نظر آتے ہیں جنہیں ہم پہچان نہیں سکتے۔ تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ وہ آسمانی مخلوق ملائکہ مقربین تھے جو مسلمانوں کی طرف سے کفار کے ساتھ نبرد آزما تھے۔

لیکن قرآن کریم نے جہاں ان ملائکہ کا ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی تصریح کر دی ہے کہ لَمْ تَرَوْهَا (۹/۲۶؛ ۹/۴۰؛ ۳۳/۹)، تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے (اس لئے کہ ان کا مشن لِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِ - (۳/۱۲۵)۔ دلوں کو اطمینان بخشنا تھا۔) قرآن کریم کی اس تصریح سے واضح ہے کہ یہ روایت جو اوپر درج کی گئی ہے (کہ صحابہؓ نے ان ملائکہ کو دیکھا تھا) صحیح نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ قرآن مجید کے بیان سے ٹکراتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر ہماری حالیہ جنگ میں "ملائکہ کا نزول" ہوا بھی تھا تو وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے، لہٰذا، وہ تمام "مشاہدات" جن میں کہا گیا ہے کہ لوگوں نے ان مافوق الفطرت قوتوں کو انسانی پیکروں میں دیکھا، ذہنِ انسانی کے تخیلات سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتے۔"

ان افسانہ خیزیوں کا اثر خود فوجی نوجوانوں پر کیا پڑ رہا تھا، یہ حقیقت بھی انہی دنوں سامنے آ گئی۔ جنگ کے بعد پرویز صاحب نے ان محاذوں کو خود جا کر دیکھا جہاں حق و باطل کے یہ معرکے برپا ہوئے تھے۔ ان کی یہ روئیداد (ان کے اپنے قلم سے) طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا۔

"پاکستان کی نئی زیارت گاہیں"

اس سلسلہ میں انہوں نے چونڈہ کے محاذ کی روئیداد بیان کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ہم اس میدان کے ولولہ انگیز ماحول میں پھر رہے تھے، اور جس مقام پر کوئی میر العقول کا نامہ سامنے آتا تھا، ان مجاہدوں کے لئے، جن میں سے کچھ اس وقت بھی ہمارے ساتھ تھے، میرے لب پر بے ساختہ زمزمۂ تبریک وتہنیت آجاتا تھا۔ ان میں ایک نوجوان افسر تھا، بڑا ہنر اور ذہین۔ اس نے مجھے، کچھ رازدارانہ انداز سے، آہستہ سے کہا کہ مجھے ایک بات بتلایئے۔ آپ ہمارے ان کارناموں پر، قدم قدم پر ہماری تعریف وتوصیف کے گیت گا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ غیب کی قوتوں نے کیا۔ ہمارا نشانہ ٹھکانے لگا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گولہ ہمارے توپچی نے نہیں پھینکا تھا۔ کسی سبز پیرہن بزرگ نے پھینکا تھا۔ ہم نے اپنی جانیں دے کر، دشمن کو پسپا کیا تو وہ ہم نے نہیں کیا، سفید گھوڑیوں پر سوار روحانی فوج نے کیا۔ جب یہ سب کچھ ان غیبی قوتوں نے کیا تو اس میں ہمارا (CREDIT) کیا ہے؟ میں نے دیکھا کہ اس کی اس تنقید میں طنز سے کہیں زیادہ ملال اور افسردگی کا پہلو نمایاں تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ اُف! یہ افسانے (جنہیں خواہ بطور سازش پھیلایا گیا ہو یا بربنائے جہالت) کس قدر حوصلہ شکن نتائج پیدا کر گئے ہیں۔ ہمارے وہ جانباز مجاہد، جنہیں اپنے کارناموں پر فخر سے سر اٹھا کر چلنا چاہیئے تھا ان افسانوں سے ان کے دل بجھ گئے ہیں۔ یہی وہ خطرہ تھا جس کے پیش نظر طلوع اسلام نے یہ کہا تھا کہ

ان حقیقتوں کو افسانے نہ بننے دیجئے

مجھے بتایا گیا کہ ان سپاہیوں نے یہ کچھ صرف اخبارات میں نہیں پڑھا۔ ہمارے جو بزرگ ان محاذوں کو دیکھنے آتے ہیں، انہوں نے بھی ان سے یہی کچھ کہا ہے۔ اور اس سے ان پر غیر شعوری طور پر بڑا حوصلہ شکن اثر ہوا ہے۔

میں نے اس نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ عزیزم! ذرا اتنا سوچو کہ اگر یہ کارنامے ان غیبی قوتوں نے سرانجام دیتے ہیں تو پھر "نشان حیدر" میجر عزیز بھٹی (شہید)۔ اور "ہلال جرأت" ملک اختر کو کیوں دیا جا رہا ہے؟ نوجوان بڑا ذہین تھا۔ ایک ثانیہ میں بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ اور کہنے لگا کہ "پھر قوم میں یہ (DUAL PERSONALITY) کیوں کارفرما ہے؟" میں نے کہا کہ اس کے متعلق میں تفصیل سے، فرصت کے وقت بات کروں گا۔

اور یہ فرصت مجھے اس وقت مل گئی جب ہم میس کے باہر، دوپہر کے کھانے کے بعد بیٹھے۔ اس مجلس میں، اور افسر بھی تھے اور جوان بھی۔ اس سے پہلے، فوجیوں کے اس قسم کے ریمارکس بھی مجھ تک پہنچ چکے تھے کہ ہم سترہ برس تک کاہل، اپنے اہل وطن کے طعن سنتے رہے۔ کوئی کہتا کہ یہ فوجی مفت میں بیٹھے قوم کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش اڑا رہے ہیں۔ کہیں سے آواز آتی کہ ان سے نہریں کھدوایئے۔ کوئی کہتا ان سے سڑکیں کٹوایئے پچھلے دنوں فوج کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا تو ملک میں ایسے کہرام مچ گیا گویا فوج نے قوم کو لوٹ لیا ہے۔ ہم یہ سب

کچھ سنتے تھے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ جب تک کوئی معرکہ سامنے نہ آئے، فوج کیا بتا سکتی ہے اور کیسے بتا سکتی ہے کہ اس کی اہمیت کیا ہے۔ خدا خدا کر کے یہ موقع ملا کہ ہم اپنی ہستی کا جواز اور اپنے مقام کی اہمیت کا مظاہرہ کر سکیں۔ ہم نے ایسا کیا اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اہلِ ملک نے جنگ کے دوران اس کا دل کھول کر اعتراف کیا۔ لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی، یہ حکایتیں پھیلنی شروع ہو گئیں کہ یہ سب کچھ غیبی قوتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ فوج کا اس میں کیا ہے؟ اس سے ہم پھر اُسی مقام پر آ گئے جہاں پہلے تھے۔

میں اس قسم کی باتیں سن چکا تھا۔ اس لئے میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ضروری خیال کیا کہ اس باب میں قرآنی حقیقت کو ان کے سامنے پیش کر دوں۔ چنانچہ میں نے ان سے تفصیل سے باتیں کیں جن کا انداز یہ تھا کہ:

"عزیزانِ من! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ انسانوں کی دنیا میں خدا کے پروگرام غیبی قوتوں سے نہیں۔ بلکہ انسانی ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ قرآن کریم میں دیکھئے جہاں مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ کی اجازت دی گئی ہے وہاں کہا گیا ہے کہ "اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ سرکش اور مستبد لوگوں کی روک تھام کے لئے انسانوں کی جماعتیں ڈٹ کھڑی ہوں، تو کسی کا کچھ بھی محفوظ نہ رہے"۔ آپ نے دیکھا کہ دنیا میں مستبد قوتوں کی روک تھام کا انتظام، انسانی جماعتوں کے ذریعے کرایا جاتا ہے۔ اور دیکھئے! مکہ کے مظلوم، اپنی حفاظت کے لئے خدا سے فریاد کرتے ہیں، اور خدا، مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم سنتے نہیں کہ وہ کمزور و ناتواں، مظلوم کس طرح بلک بلک کر ہم سے مدد مانگ رہے ہیں۔ تم ان کی امداد کے لئے کیوں نہیں اٹھتے؟ آپ نے دیکھا کہ خدا ان مظلوموں کی امداد کے لئے کوئی غیبی قوت نہیں بھیجتا۔ مدینہ کے مسلمانوں سے کہتا ہے کہ تم ان کی مدافعت کے لئے اٹھو۔ یہی وہ مجاہد ہیں جن کے متعلق وہ (خدا) کہتا ہے کہ جو لوگ خوف و ہراس کے حوصلہ شکن حالات میں نہایت پامردی سے مقابلہ کے لئے کھڑے رہتے ہیں اس لئے ہم ان پر تہنیت و تبریک کے پھول برساتے ہیں (اُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ)۔ اس کے برعکس، ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی سپاہی، میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگا تو وہ سیدھا جہنم میں جائے گا۔ ان تمام مقامات میں آپ نے دیکھا کہ میدانِ جنگ میں فتح و کامرانی کا سبب، ان مجاہدین کے ثباتِ واستقامت اور جانبازی و سرفروشی کو قرار دیا جاتا ہے، نہ کہ کسی غیبی قوت کو۔ اور اسی کے لئے انہیں اس قدر تاکید کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدین سے کہا تھا، کہ اگر تم میں بیس سپاہی بھی جم کر ثابت قدمی سے مقابلہ کریں گے، تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آ جائیں گے۔ اس میں دیکھئے کہ دشمن کے دو سو سپاہیوں کو مغلوب کرنے کے لئے ہمیں ثابت قدم مجاہدین کی ضرورت لاینفک قرار دی گئی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اگر تم میں سے کوئی بھی مقابلہ کے لئے کھڑا نہیں ہو گا تو بھی دشمن کے (کم از کم) ایک سو اسی

سپاہی ہماری غیبی قوتوں سے تباہ کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر ان ہی کے لئے استقامت اور ثبات کی شرط ضروری سمجھی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساز و سامان کی موجودگی بھی۔ کیونکہ وہیں یہ کہہ دیا گیا کہ یہ ایک اور دس کی نسبت پورے ساز و سامان کے ساتھ ہے۔ سردست جب تم میں ساز و سامان کی مقابلۃً کمی ہے، تم اپنے سے دوگنی تعداد پر بالضرور غالب آجاؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی بھی تاکید کر دی کہ تم اپنی سرحدوں کو گھوڑوں کے رسالوں سے خوب مستحکم رکھو (اُس زمانے میں بہترین استحکام کا یہی ذریعہ تھا)۔ یہ نہیں کہا کہ تم میدانِ جنگ میں چلے جاؤ۔ تمہاری سرحدوں کی حفاظت غیبی قوتیں کریں گی۔ اس لئے یاد رکھیئے! اس جنگ میں جس قدر کامیابی ہوئی ہے، وہ آپ کی اور صرف آپ کی ہمتوں کا صدقہ ہے اور اس کا سہرا صرف آپ کے سر ہے۔ اس میں کسی "سبز پوش یا سفید قبا" والے کا کوئی دخل نہیں۔ آپ قوم کے نزدیک بھی درخورِ صد تعریف و ستائش ہیں اور خدا کے ہاں بھی مستحق ہزار درجات و مناصب۔

میں یہ کہہ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہروں پر سرخی دوڑتی جا رہی ہے۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو رہی ہے اور ان کے سینوں میں تازہ ولولے بیدار ہو رہے ہیں۔

ان میں سے ایک مجاہد نے (جو ذرا زیادہ عمر کا تھا) پوچھا کہ جس چیز کو تائیدِ خداوندی کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟

میں نے کہا کہ اس کے متعلق بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر کام کیلئے قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ جو شخص ان قوانین کے مطابق کام کرتا ہے اس کا نتیجہ نفع بخش اور کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ اسے تائیدِ خداوندی کہتے ہیں۔ یہ قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک قانون تو یہ ہے کہ جب آپ توپ کا رُخ ٹھیک کر کے صحیح زاویے کے مطابق، عین وقت پر گولہ چلائیں گے تو وہ ٹھکانے پر لگے گا۔ دوسرا قانون یہ ہے کہ اگر آپ عدل اور انصاف کی خاطر جنگ کریں گے، آپ کا مقصد مظلوموں کی امداد ہو گا، اور آپ جنگ میں بلند اخلاق کو پیشِ نظر رکھیں گے، تو آپ کے اندر ایسی قوتیں بیدار ہو جائیں گی جن سے آپ کا ایک ایک سپاہی، دس دس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اسے کہتے ہیں "خدا کی راہ میں لڑنا"۔ اس طرح لڑنے والوں کو خدا نے "حزب اللہ" یعنی اللہ کا لشکر کہا ہے اور اس جنگ کو "خدا کی مدد کرنا" قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ۔ (۲۲/۴۰) "خدا یقیناً اس کی مدد کرے گا جو خدا کی مدد کرے گا"۔ یعنی جو لوگ ان مقاصد کی خاطر جنگ کریں گے جنہیں خدا نے اچھا قرار دیا ہے، اور جنگ میں ان امور سے مجتنب رہیں گے جن سے اُس نے روکا ہے، تو انہیں ایسی جمعیتِ خاطر اور اطمینانِ قلب نصیب ہو گا جس سے ان کی ہمتیں بلند اور حوصلے زیادہ ہو جائیں گے اور خطرات کے مقابلہ کے وقت ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئے گی۔ اس کا نام تائیدِ خداوندی ہے۔ لیکن یاد رکھیئے۔ اگر آپ "توپ کے گولے والے" قانون میں غلطی یا سستی کر جائیں گے تو اس

سے نقصان ہو کر رہے گا۔" جنگِ اُحد میں، نبی اکرمؐ سپہ سالار اعظم تھے اور صحابہ کبارؓ سپاہ۔ یہ لشکر حق و صداقت کے لئے میدان میں نکلا تھا۔ اس لئے انہیں خدا کی تائید حاصل تھی۔ لیکن جب ان کے ایک دستہ نے ذرا سی غلطی کی تو ان کی فتح شکست میں بدل گئی۔ (اور تو اور) خود نبی اکرمؐ کو بھی زخم آئے۔ کسی غیبی قوت نے انہیں، اس غلطی کے نقصان سے نہیں بچایا۔ حق کی خاطر لڑنا اور توپ کا رُخ صحیح رکھنا، اس سے جو خوشگوار نتائج پیدا ہوتے ہیں، انہیں تائیدِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس طرح جنگ کرنے کا بھی سارا (CREDIT) مجاہدین کو ملتا ہے۔ ان مجاہدین کو جن کے ہاتھوں خدا کے پروگرام تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ایک نوجوان نے کہا کہ روحانی قوت بالآخر ہوتی ہی ہے نا! میں نے کہا۔ ہاں ہوتی ہے۔ لیکن وہ مجاہد کے دست و بازو میں ہوتی ہے۔ یہی وہ دست و بازو تھے جن کی حیرت انگیز قوت کو دیکھ کر خود خدا نے کہا تھا۔ کہ "میدانِ جنگ میں تم نے نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ تم تلواروں کا وار نہیں کر رہے تھے، ہم کر رہے تھے"۔ یاد رکھئے ــــ ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ــــ آپ نے غور نہیں کیا کہ خدا نے مجاہدین کے گھوڑوں کے سموں سے اڑنے والے گرد و غبار کی قسم کھائی ہے۔ ان کے نعلوں سے ابھرنے والی چنگاریوں کی قسم کھائی ہے۔ کسی روحانی قوت کے مدعی کے تسبیح و مصلے کی قسم نہیں کھائی۔ اس لئے مجاہد کا مقام سب سے اونچا ہے آپ کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

ان قرآنی بصائر کا نتیجہ تھا کہ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے ہیں تو وہاں کی فضا بدل چکی تھی۔ یہاں پہنچنے پر مجھے جو خط موصول ہوا اس میں تحریر تھا کہ

اس رجمنٹ کے سب افسران اور جس جس جوان سے آپ ملے نہایت متاثر ہوئے ان کا (MORALE) تا بفلک جا پہنچا۔ (دوبارہ) جنگ سے پہلے کہیں آپ سے دو چار باتیں سن لیں تو کم از کم اس یونٹ کے جوان بخوشی سر دھڑ کی بازی لگا لیں۔

مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ فالحمد للہ۔

طلوعِ اسلام

یہ دو سال پہلے لکھا گیا تھا۔ لیکن عربوں کی حالیہ جنگ نے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ فتح اور شکست خود انسانوں کے کردار پر منحصر ہوتی ہے۔ ورنہ اگر (۱۹۶۵ء میں) "دانا کی نگری" کو بچانے کے لئے یہ محافظین آسمان سے اترے تھے، تو بیت المقدس کی حفاظت کے لئے ـــ جہاں اولیاء عظام کے نہیں بلکہ انبیاء کرام کے اس قدر مزارات ہیں ـــ پرے کے پرے زمین پر آنے چاہئیں تھے۔ لیکن وہاں نہ کوئی سبز عمامے والا نظر آیا، نہ سفید گھوڑی والا۔ اور وہ مقدس خطۂ زمین، دیکھتے ہی دیکھتے مغضوب علیہ یہودیوں کے قبضہ میں چلا گیا ـــ ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون۔

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

(۱) قرآن کریم مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ تمام نوع انسان کے لئے خدا کی طرف سے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اس لئے حضورؐ کی سیرت کے نقوش قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

(۲) حضورؐ کی سیرت طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتب روایات و تاریخ میں آئی ہیں، ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہوں۔

(۳) جو حکومت، قرآن کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کرے گی ـــ اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت یا اسلامی مملکت کہا جائیگا۔

(۴) اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ـــ خوراک، مکان، لباس، علاج وغیرہ ـــ بہم پہنچائے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا عمل) تھیاکریسی (یعنی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھے جانا) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کی بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

(۶) اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار جوہر ذاتی اور پختگی سیرت و کردار ہوگا۔

(۷) طلوع اسلام پاکستان میں اسی قسم کے اسلامی نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے، نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے۔ امت کے موجودہ فرقے جیسطرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں یہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

(۸) اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں تو طلوع اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اسکا ساتھ دیجئے۔ ناظم

بیا تا گل بیفشانیم

شہید عزیز

۱۱ ستمبر ۱۹۶۵ء — آج مسلسل چھ دن اور چھ راتیں ہو گئیں تھیں کہ میجر عزیز ایک لمحہ کے لئے آنکھ جھپکے بغیر گولوں کی بارش میں کھڑے، میدانِ جنگ کے سب سے زیادہ نازک اور خطرناک مقام پر، اپنی جان ہتھیلی پر لئے کھڑے تھے۔ ساتھی جوانوں، رفیقوں حتٰے کہ افسروں تک نے ہر ممکن کوشش کر دیکھی کہ وہ کچھ وقت کے لئے پیچھے ہٹ کر تھوڑا سا آرام کر لیں، لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، اسے ایک شاہد عادل کی زبانی سنیئے:۔

"صوبیدار غلام محمد سے باتیں کر رہے تھے کہ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل محمد ابراہیم قریشی کا پیغام آیا کہ ایک ضروری کانفرنس کے لئے فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں۔ نائب صوبیدار شیر دل کو بلا کر کہا۔ صاحب! اب آپ کو میرے بعد سارا کام خود ہی کرنا ہو گا۔ میرے واپس آنے تک دشمن پر کڑی نظر رکھیں اور ضرورت کے مطابق فائر کرواتے رہیں۔ میں ذرا فیلڈ ہیڈ کوارٹر جا رہا ہوں۔

کمانڈنگ آفیسر محمد ابراہیم قریشی، میجر محمد اصغر، کیپٹن انور منیر الدین، اڈجوٹنٹ اور کیپٹن ولث وکوارٹر ماسٹر، فیلڈ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ میجر عزیز بھٹی کی تیز رفتار جیپ ان کے پاس آکر رکی۔ ۱۲۰ گھنٹے برکی کے انتہائی نازک محاذ پر تاریخی کردار ادا کرنے والا مجاہد پوری مستعدی کے ساتھ جیپ سے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ساتھی افسروں کی جانب بڑھا۔ سب نے اٹھ کر میجر بھٹی کو گلے لگایا اور ان کے عظیم الشان کارنامے پر انہیں مبارکباد دی۔

میجر بھٹی کی حیرت انگیز مستعدی، ان کے چہرے کے تاثرات اور گل لالہ کی مانند سرخ آنکھیں ان کی بے تاب سرگرمیوں، ان کی بے خواب راتوں، اور عسکری تاریخ میں اُن کے لاجواب کارناموں کی داستانیں سنا رہی تھیں۔

میجر بھٹی مجوزہ کانفرنس سے جلد فارغ ہونے کے بعد بعجلت تمام واپس جانے کے لئے بیقرار تھے۔ مگر انہیں معلوم ہوا کہ انہیں کسی اہم کانفرنس کے لئے نہیں بلایا گیا، بلکہ ان کے کمانڈنگ آفیسر انہیں آرام پہنچانا چاہتے ہیں۔ کرنل قریشی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا: "بھٹی صاحب! میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ نے اس محاذ پر ایک تاریخی جنگ لڑی ہے۔ آپ کے پاس جوانوں کی انتہائی کم نفری کا مجھے شدید احساس رہا، آپ کے کارنامے حیرت انگیز ہیں۔ آپ نے لاہور کو دشمن کے ناپاک قدموں سے بچا لیا ہے۔ آپ نے مسلسل چھ یوم سے مطلق آرام نہیں کیا۔ آپ اپنے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے پہلے بھی آپ کو واپس بلایا تھا مگر آپ ٹال گئے تھے۔ مجھے ڈر تھا، آج بھی آپ ٹال نہ جائیں۔ اس لئے آج بہانے سے بلایا ہے۔ میں آپ کی جگہ دوسرا افسر بھیج رہا ہوں۔ آپ آرام کریں۔ آپ کو پھلے مورچوں پر بھیج دیتے ہیں۔

میجر بھٹی نے کہا: "سر! میں احساس اور جذبے کے تحت آپ نے مجھے واپس بلایا ہے میں اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور تہ دل سے اس کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن

آپ یقین مانیں۔ میرے لئے آرام و راحت محاذ پر ہے۔ حقیقت میں تکلیف اور آرام صرف جسمانی نہیں ہوتے، ان کا تعلق انسان کے احساسات سے ہے۔ مثلاً مجھے اگر محاذ سے واپس بلا لیا جائے تو میرے لئے یہ ایک روحانی عذاب ہوگا۔ بلاشبہ ان دنوں میں نے اپنے جسمانی آرام و آسائش اور استراحت کی پروا نہیں کی۔ لیکن آپ باور کریں کہ مجھے اس کا بہت زیادہ صلہ ملا ہے۔ جذباتی طور پر یہ لمحات میرے لئے انتہائی روحانی مسرت اور اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میرے جوانوں نے اپنی قوت ایمانی اور کوہ پیکر عزم کے ساتھ دشمن کی کئی گنا زیادہ فوج اور بے پناہ اسلحہ کے باوجود اس کی یلغار کو روک دیا ہے اور ہر مقابلے میں اسے شکست دی ہے۔ مگر مجھے یہ احساس ہے کہ پاکستان کے پاس اتنی زیادہ فوج نہیں کہ ہم ہر محاذ پر تازہ دم فوج بھیج کر سب مجاہدین کو آرام دلا سکیں۔ دریں حالات میرے لئے یہ امر ناقابل تصور ہے کہ میں اپنے جوانوں کو محاذ پر چھوڑ کر یہاں آرام کرنے بیٹھ جاؤں۔ ملک کا بچہ بچہ برسرپیکار ہے۔ یہ صرف لاہور کے تحفظ کا سوال نہیں ہے، پاکستان بلکہ اسلام کے تحفظ کا سوال ہے۔

محترم قریشی صاحب! ملک و ملت پر موجودہ نازک وقت ہم سے عظیم قربانیوں کا تقاضا کرتا ہے واللہ! میں تو اس راہ میں جانِ عزیز کی قربانی بھی حقیر سمجھتا ہوں۔ خدا کے لئے آپ میرے لئے

تشویش نہ کریں۔ میرے اعصاب بڑے مضبوط ہیں مجھے کوئی تکان محسوس نہیں ہوتی۔ میں آرام نہیں
کرنا چاہتا۔ میں پچھلے مورچوں پر نہیں جاؤں گا۔ بلکہ وطن پاک کی حفاظت کرتے ہوئے
جامِ شہادت نوش کرنا پسند کروں گا۔

کرنل قریشی میجر بھٹی کے دلائل، ان کے جوشِ جہاد اور ملک وملت کے لئے جذبۂ ایثار سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ میجر بھٹی کو محاذ سے واپس بلانا ان کے ساتھ ظلم کے مترادف ہوگا۔ البتہ انہوں نے میجر عزیز کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ چند گھنٹے تو آرام کریں۔ لیکن میجر بھٹی وہاں ایک گھنٹہ سے زیادہ نہ رُکے۔

کرنل قریشی اور دوسرے دوستوں سے رخصت ہو کر میجر بھٹی واپس محاذ پر پہنچ گئے۔ جاتے ہی نائب صوبیدار شیر دل سے کہا۔ صاحب! اب آپ آرام کریں اور میں دشمن کی خبر لیتا ہوں۔ دشمن کی پوزیشن کا جائزہ لے کر اس پر فائر کا حکم دیا۔ مگر دشمن کی ایک مشین گن جو بالکل سامنے لگی ہوئی تھی وہ کسی طرح تباہ نہیں ہو رہی تھی۔ اس لئے سکین علی کو پار لانے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔ کہنے لگے۔ ایک سیکشن پار بھیجنا چاہتا ہوں مگر اس نامراد توپ کا بہت خطرہ ہے۔ اُس توپ کا رینج دے کر متعدد بار فائر کرائے مگر وہ توپ کچھ اس طرح نصب تھی کہ گولہ باری اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکی۔ گولہ باری دونوں جانب سے ہو رہی تھی۔ لانس نائیک محمود زخمی ہو گیا۔ ایمبولینس میں اسے سی ایم ایچ لاہور بھیج دیا گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ حوالدار کوارٹر ماسٹر محمد اکرام کھانا لے کر آیا۔ میجر بھٹی کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ سب جوانوں میں کھانا تقسیم ہو چکا ہے۔ اپنے متعلق کوارٹر ماسٹر اکرام سے کہنے لگے کہ میں فیلڈ ہیڈ کوارٹر سے چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ کھا چکا ہوں، اب کھانا نہیں کھاؤں گا۔

میجر بھٹی پٹڑی پر چڑھ کر دائیں بائیں دشمن کا جائزہ لے رہے تھے۔ جہاں ضرورت سمجھتے فائر کرواتے رہے دوسری طرف سے بھی گولہ باری ہو رہی تھی۔ ایک گولہ پٹڑی کے قریب پڑا۔ اس سے نقصان تو کوئی نہیں ہوا مگر میجر بھٹی کو کوئی خیال آیا تو مورچوں میں جا کر جوانوں سے کہنے لگے۔ مورچوں میں جہاں کہیں اینٹیں ہیں انہیں نکال دیں ان پر بم اگر گرے تو یہ بھی بم بن جاتی ہیں اور نقصان پہنچاتی ہیں۔

پھر پٹڑی پر چڑھ کر دشمن کا جائزہ لیا۔ کوئی نقل و حرکت نہ تھی۔ اُتر کر انور سے کہا۔ "ایمبولینس سے سٹریچر نکالیں میں ٹسٹ کرتا ہوں۔ آیا اس پر نیند آتی ہے یا نہیں" انور نے سٹریچر نکال کر دیا۔ اس پر لیٹ کر کہنے لگے "بھئی یہ تو بہت آرام دہ ہے۔" انور سے کہا۔ اب آپ بھی آرام کریں۔" سٹریچر سے اُٹھ کر (مارٹر اوپی) حوالدار اللہ دتہ سے کہا۔ "میں ذرا آرام کرلوں۔ آپ لوگ اتنی دیر خیال رکھیں۔" اور پُل کے علاقہ میں خاص احتیاط رکھیں۔ خود پٹڑی پر ایک

چکر لگا کر واپس آ گئے۔ اور سٹریچر پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر اونگھنے کے بعد اٹھ بیٹھے۔ اتنے میں اکرم کوارٹر ماسٹر چائے لیکر آ گیا۔ میجر بھٹی نے چائے کی پیالی ہاتھ میں لی۔ آنکھیں بند تھیں۔ اکرم سے پوچھا کیا جوانوں کو چائے دے دی ہے؟ اکرم نے جواب دیا۔ جوانوں میں چائے تقسیم ہو رہی ہے۔ پھر فرمانے لگے۔ ہاں تو رات توپخانہ کے ۳۶ آدمی اور آ گئے تھے۔ ان کے لئے بھی چائے کا انتظام کیا ہے؟ اکرم نے کہا۔ ان کے لئے بھی انتظام کر دیا ہے اور ان میں بھی چائے تقسیم ہو رہی ہے۔ چائے کے ساتھ پوریاں بھی تھیں۔ پوری چکھ کر کہنے لگے "سب کو اسی طرح کی پوریاں تقسیم کی ہیں نا!" اکرم نے کہا۔ "جی ہاں! سب کے لئے ایسی ہی پوریاں تیار کروا کر لایا ہوں۔"

کہنے لگے۔ "بہت مزیدار پوریاں ہیں۔"

چائے ختم کر کے پیالی اُسے واپس دی۔ آنکھیں بدستور بند تھیں۔ متواتر جاگتے رہنے کے باعث آنکھیں سوج چکی تھیں۔ جھپکنے میں بھی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ اور بند کر کے کھولنا بھی تکلیف دہ تھا۔ اکرم چلا گیا تو لیٹ گئے۔ پانچ سات منٹ بعد اٹھے اور انور سے کہا۔ سٹریچر اپنی گاڑی میں رکھ لیں۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ میجر عزیز بھٹی پٹڑی سے نیچے اُتر آئے۔ امان اللہ خان سپاہی سے پانی لے کر وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی۔

امان اللہ خان چائے تیار کرنے لگا گرم پانی لے کر شیو بنائی تو امان اللہ خان نے کہا۔ صاحب! میں پانی لا دیتا ہوں۔ آپ غسل کر لیں۔

کہنے لگے۔ نہر سے پانی لانا خطرناک ہے۔

امان خان: سر! میں ابھی بستی سے پانی لے آتا ہوں۔

میجر بھٹی کہنے لگے۔ رہنے دیں اور اسی پانی سے ذرا سر دھلا دیں۔

چنانچہ گرم پانی سے سر منہ دھویا۔ کئی دن بعد بالوں میں کنگھی کی۔

یہ ان کی زندگی کی آخری صبح تھی۔ وہ غیر شعوری طور پر کسی طویل سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ اتنے میں صوبے دار غلام محمد آ گئے۔ صوبے دار غلام محمد کے ساتھ مل کر چائے پی۔

پیالی رکھ کر اچانک غلام محمد کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگے "یار! آپ کو پامسٹری میں بڑی دسترس ہے، ذرا ہاتھ تو دیکھیں!"

غلام محمد نے ہاتھ کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا۔ "جناب آپ کے ہاتھ کی لکیریں دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کی غماز ہیں۔ ہاتھ کے اُبھار بڑے نمایاں ہیں۔"

"یہ باتیں تو اپنی جگہ درست ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا میری قسمت میں شہادت بھی ہے یا نہیں؟"

صوبیدار غلام محمد نے دوبارہ دونوں ہاتھوں کا بغور مشاہدہ کیا اور پوری سنجیدگی سے کہہ دیا۔ "جناب! آپ کی قسمت میں شہادت تو ہے مگر وقت کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا کہ شہادت عمر کے کس حصے میں نصیب ہوگی؟"

میجر بھٹی نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اور کہا۔ "صوبیدار صاحب! اگر آپ صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے تو میں آپ کو بتا دوں۔ میری شہادت بہت قریب ہے۔"

میجر بھٹی نے امان خاں کو نئی وردی لانے کے لئے کہا۔

امان خان وردی لے کر آیا تو دیکھ کر کہنے لگے "یہ وردی میری تو نہیں ہے۔"

امان خان نے بتایا۔ "سر! آپ کی وردی لانے کے لئے فیلڈ ہیڈ کوارٹر گیا۔ لیکن آپ کی وردی نہیں ملی۔ وہیں سے ایک افسر نے اپنی وردی آپ کے لئے بھیج دی ہے۔"

پھر مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔ "وردی اور کفن اپنا ہی سجتا ہے۔"

میجر بھٹی کی زندگی کا آخری سورج طلوع ہو چکا تھا۔

کمپنی ہیڈ کوارٹر کے پاس حوالدار نذیر کی پلاٹون کی بائیں جانب سے نہر کی پٹڑی کے اوپر آئے اور دوربین کے ساتھ مشاہدہ کرنے لگے۔

حوالدار میجر فیض علی پٹڑی کے نیچے تھا۔ دشمن کی طرف سے فائر آ رہا تھا۔ فیض علی نے میجر بھٹی سے کہا: "سر! فائر آ رہا ہے۔ نیچے آ جائیں۔"

میجر عزیز نے جواب دیا۔ "نیچے سے مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ یہاں خطرہ ہے لیکن موت و حیات اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اگر شہادت میرے مقدر میں ہے تو زہے قسمت!"

اتنے میں برکی سے نہر کی طرف بڑھتے ہوئے چند ٹینک نظر آئے۔ ان کے پیچھے پیدل فوج بھی تھی۔ میجر بھٹی نے ڈگری دے کر فائر کرایا۔ گولہ نشانے پر نہ پڑا۔ دوبارہ میسج پاس کیا۔ اس مرتبہ گولے صحیح نشانوں پر پڑے۔ بڑے خوش ہوئے۔ دشمن کے دو ٹینک تباہ ہوئے۔ توپ خانہ کا انچارج کیپٹن انور فائر کروا رہا تھا۔ خوش ہو کر کہا: "ویل ڈن انور!" یہ الفاظ ان کی زبان پر ہی تھے کہ سامنے سے ایک گولہ آیا جو ان کے قریب شیشم کے درخت کو قلم کرتا ہوا اینٹوں کے اس ڈھیر پر گرا جو مورچوں سے نکال کر وہاں اکٹھی کی ہوئی تھیں۔ میجر بھٹی اس جگہ سے بمشکل چند فٹ کے فاصلہ پر کھڑے تھے۔ پٹڑی پر گرد و غبار اٹھا۔ ساتھیوں نے سمجھا کہ میجر صاحب زخمی ہو گئے۔ وہ بھاگ کر آگے بڑھے۔ مگر میجر بھٹی کو خراش تک نہیں آئی۔ ساتھیوں سے کہا: "آپ فوراً واپس اپنی پوزیشن لے لیں۔ یہ گولہ میرے لئے بنا ہی نہیں تھا۔ ابھی وہ گولہ بھارت کے کارخانے میں تیار نہیں ہوا۔"

صبح کے ۹ ½ بج رہے تھے۔

"تقدیر" میجر بھٹی کے ان الفاظ پر مسکرا رہی تھی۔ وہ دوربین لے کر دشمن کا مشاہدہ کرنے ہی والے تھے کہ اسی لمحہ ٹھوس فولاد کا ایک گولہ ان کے سینے کو چیرتا ہوا دائیں پھیپھڑے سے پار ہو چکا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرے۔ حوالدار میجر فیض علی اور سپاہی امان خان ڈرائیور ان کے پاس پہنچے تو فرض شناسی اور شجاعت کا پیکر، قربانی و ایثار کا مجسمہ اور عسکری تاریخ کا عظیم ہیرو اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہا تھا ؎

لو وصل کی ساعت آپہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا در باز کیا!

(ماخوذ از "عزیز بھٹی شہید"۔ مصنفہ اصغر علی گھرال)

شمس غازی

۴ ستمبر کی صبح اُسے پیشاب میں خون آیا۔ وہ رات بھر گُردے کے ناقابلِ برداشت درد سے تڑپتا اور کراہتا رہا تھا۔ اور اُسے تیز بخار تھا۔ لمحہ بھر کے لئے بھی آنکھ نہ لگی تھی بے حال ہو ہو کر اس نے ہسپتال جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کی ذات میں ایک جذبہ اور ایک احساس بیدار ہو کر اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اور اسے ہسپتال نہ جانے دیا۔ فلائٹ لیفٹیننٹ سید شمس الدین احمد لیسے وقت بال و پر بریدہ ہو کر ہسپتال میں جا گرنے سے گریز کر رہا تھا، جب برصغیر کے آسمان پر جنگ کی گھٹائیں تیزی سے گہری ہو رہی تھیں۔ وہ بیمار ہوا باز تھا۔ فضائیہ میں آکر اُس نے ملک سے وفاداری کا جو عہد کیا تھا اُسے اُس عہد کا پاس تھا۔ (ٹریننگ کے اختتام پر مسلح افواج کے ہر فرد سے ایک عہد نامہ پر دستخط کرائے جاتے ہیں، جس کے الفاظ مختصراً یہ ہوتے ہیں کہ میں ملک و ملت کا وفادار رہوں گا اور ملک کے دفاع میں جان دینے سے گریز نہیں کروں گا۔) — فلائٹ لیفٹیننٹ شمس الدین کو گوارا نہ تھا کہ آزمائش کی اس کٹھن گھڑی وہ عہد پورا کرنے سے قاصر رہے۔ وہ وقت آن پہنچا تھا جس کے لئے پاک فضائیہ نے اسے بڑی جاں فشانی سے تربیت دی تھی۔ لیکن گُردے کے درد کی شدت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ اس حال میں اسے ہسپتال چلے جانا چاہیئے تھا۔

۴ ستمبر کا دن گزر گیا۔ ایک اور رات کرب و ابتلا میں گزر گئی۔ ۵ ستمبر کا دن ۴ ستمبر سے بہتر نہ تھا۔ اور رات گزری ہوئی راتوں کی طرح علیل اور بے آرام تھی لیکن شمس الدین احمد ہسپتال نہ گیا۔ وہ ملک و ملت سے وفاداری کا عہد پورا کرنے کے انتظار میں گُردے کا شدید درد کسی کو بتائے بغیر برداشت کرتا رہا۔

اُسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ چھ ستمبر کی سحر بھارتی سورمے چوروں کی طرح لاہور کی سمت سے بین الاقوامی سرحدوں میں گھس آئے۔

اٹھائیس سال کا بھالا جانباز فلائٹ لیفٹیننٹ شمس الدین احمد ہوائی اڈے کے اپریشن روم میں داخل ہوا۔ (یاد رہے کہ یہ کسی ہسپتال کا اپریشن روم نہیں تھا۔ بلکہ ہوائی اڈے کا اپریشن روم تھا جہاں سے ہوابازوں کو دفاعی یا جارحانہ حملوں یا دشمن کے حملہ آور طیاروں سے جھڑپ لینے اور ہر قسم کی جنگی پروازوں کی آخری ہدایات دی جاتی ہیں) شمس اس کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر گردے کی بے رحم اذیت کے آثار نمایاں تھے۔ چہرے کے ایک ایک خط سے درد اور گزشتہ رات کے بخار اور شب بیداری کی مُردنی ہویدا تھی۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں جو چمک تھی اس سے جذبۂ جہاد اور حُب الوطنی کا پتہ ملتا تھا۔ وہ زندگی کا بھیانک ترین خطرہ مول لینے آیا تھا۔ ایسا خطرہ جو اس کی اپنی جان، اپنے نیوی گیٹر کی جان اور بیش قیمت طیارے کی تباہی کا باعث ہوسکتا تھا۔ وہ بمبار ہواباز تھا۔ بمبار طیارے میں ہواباز کے ساتھ ایک نیوی گیٹر (راہ دکھانے والا) بھی ہوتا ہے جبکہ لڑاکا طیارے میں صرف ایک ہواباز ہی اڑتا ہے۔ جیٹ طیارے کی تباہی اور ہواباز کی موت کے لئے کسی بہت بڑی لغزش یا حادثے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذرا سی غلطی یا ہلکی سی بے احتیاطی طیارے اور اس کے ہواباز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتی ہے۔

شمس الدین احمد ہوابازی کے اُن پُرخطر حقائق سے آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر فضا میں گردے کا درد تیز ہوگیا تو انجام صرف موت ہوگا۔ بچ نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ شمس کی اپنی اکیلی جان ہوتی تو اور بات تھی، اسے اپنے ساتھ ایک اور انسان (نیوی گیٹر) کو بھی ساتھ لے جانا تھا۔ اس نے سوچا ——— "اگر میں اس حال میں طیارے کو سنبھال نہ سکا اور تباہ ہوگیا تو کیا خدا مجھے ایک بے گناہ انسان (نیوی گیٹر) کی جان لینے پر بخش دے گا؟" ——— اس کے عزم کی راہ میں یہی ایک سوال حائل تھا۔

لیکن اس پر ایک وجدانی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ دشمن اس کے وطن پر چڑھ دوڑا تھا۔ اس کے وطن کی آبرو سخت خطرے میں تھی۔ اس حقیقت نے اس کے تمام خوف جھٹک ڈالے۔ اس کیفیت میں اسے اپنے اللہ اور اپنی ذات پر مکمل اعتماد محسوس ہونے لگا ——— یہ ایک مقدس احساس تھا۔

"کیا میں اپنے کمانڈنگ آفیسر کو بتا دوں کہ میں پرواز کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں شدید علیل ہوں؟" اُس نے سوچا۔

"نہیں" اس کی ذات سے آواز اٹھی "وہ تمہیں فوراً ہسپتال بھیج دے گا۔ کمانڈنگ آفیسر کو نہ بتانا۔ ورنہ ملک و ملت سے عہد پورا نہ کرسکو گے۔"

شمس نے اپنی زندگی کا خطرناک ترین فیصلہ کرلیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کے ساتھ نیوی گیٹر کون ہوگا؟ اس نے
اپریشن روم میں نگاہیں دوڑائیں۔ کمرے کے ایک کونے میں متین اور سنجیدہ سکواڈرن لیڈر شعیب عالم بیٹھا تھا۔
وہ نیوی گیٹر تھا۔ وہ بھی شاہباز تھا۔ لیکن اس کے پَر نوچ کر سٹاف ڈیوٹی پر ایئر ہیڈ کوارٹر کے قفس میں بند کرلیا
گیا تھا لیکن وہ شوق جہاد اور شہادت کے جذبے سے دیوانہ ہوکر کسی نہ کسی طرح سٹاف ڈیوٹی کا پنجرہ توڑ کر اس
اُمید پر اپریشن روم میں آبیٹھا تھا کہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

شمس الدین احمد نے شعیب عالم کو دیکھا تو اس کا جی نہ چاہا کہ اس بھرے بھرے چہرے مہرے اور اُمنگوں سے
بھرپور جوان کو اسی عمر میں موت کے منہ میں لے جائے۔ اس نے قدسے پس و پیش کی اور اسے خیال آیا کہ کاش وہ
فائٹر پائلٹ ہوتا اور اکیلا اڑ جاتا۔ لیکن ایمان کی حرارت نے اسے بے چین کردیا اور وہ بے قابو سا ہوکر شعیب عالم
کے پاس جا بیٹھا اور آہستہ سے پوچھا ——"میرے ساتھ اڑو گے"؟ —— یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ شعیب انکار کر دیتا۔
لیکن شمس نے اسے بتانا شروع کر دیا کہ وہ کس جسمانی حالت میں پرواز کر رہا ہے۔ اس نے شعیب عالم کو اپنے گردے
کی اذیت ناک تکلیف اور گزشتہ شب و روز کی کربناک حالت کی تفصیلات سنا ڈالیں تاکہ شعیب عالم اس کے ساتھ
جانے سے پہلے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔ یہ زندگی اور موت کا نہیں صرف موت کا سوال تھا۔ صرف موت، اپنے
مقدس وطن کے لئے جان کا نذرانہ!

"سوچ لو شعیب عالم!" اس نے کہا۔ اب بھی میرے ساتھ چلو گے؟"

"کیوں نہیں!" شعیب نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمہارے ساتھ اڑوں گا۔"

شعیب عالم انکار کیوں کر کرتا۔ جواں سال شمس کے آہنی عزم اور سرفروشی کو دیکھتے ہوئے اس نے فخر محسوس
کیا کر ...... شمس جیسے بہادر ہوابان کے ساتھ پرواز کرنے کا پھر شاید موقع نہ ملے۔ شمس حیرت زدہ سا ہوگیا۔ اسے
توقع تھی کہ اس کی جسمانی حالت اور صحت کی ابتر کیفیت کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی نیوی گیٹر اس کے ساتھ پرواز کیلئے
تیار نہیں ہوگا۔ اگر کوئی نیوی گیٹر انکار کربھی دیتا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ موت سے ڈر گیا۔ بلکہ سروس کے
قواعد و ضوابط ہیں جن کے تحت شمس الدین کو ہوائی اڈے کے اپریشن روم میں نہیں بلکہ ہسپتال کے اپریشن ٹیبل
پر ہونا چاہئے تھا۔ لیکن پاک فضائیہ کے شاہبازوں کو اپنا نہیں، اپنے وطن کا خیال تھا اور چھ ستمبر کی صبح یہی ایک
خیال سب کے دل و دماغ میں سمایا ہوا تھا۔

شعیب عالم کی پُرعزم مسکراہٹ اور اس کے ایک جملے نے کہ "میں تمہارے ساتھ اڑوں گا" شمس الدین احمد
پر سکون کی ایسی کیفیت طاری کردی جیسے اس کے روگ کو اس کے جسم نے اپنے ہی اندر جذب کر کے ختم کر ڈالا ہو۔
بل شمس اچھا بھلا فلائٹ لیفٹیننٹ شمس الدین احمد بہادر پائلٹ بن گیا۔ اپریشن روم کے باہر بلیک آؤٹ کی

تاریکی تھی۔ کہیں ایک آدھ چراغ کی ٹمٹماتی لو بھی نظر نہ آتی تھی۔ فضا میں جنگ کی تپش تھی جیسے چاند کی مدھم مدھم سی چاندنی ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

شمس اور شعیب پہلی جنگی پرواز پہ چلے گئے اور اس رات سے جنگ ختم ہونے تک دونوں دلاور ساتھی ہر رات دشمن کے فوجی ٹھکانوں اور ہوائی اڈوں پر بمباری کے لئے جاتے رہے۔ انہیں مار گرانے کے لئے دشمن کی طیارہ شکن توپوں اور مشین گنوں نے ان پر مسلسل فائرنگ کی لیکن وہ ٹریسر ایمونیشن کے جال اور طیارے کے ارد گرد پھٹتے گولوں میں اُڑتے، جھک جھک کر دشمن کی کمر توڑتے رہے۔ انہوں نے بمباری سے دشمن کے کئی اہم اڈوں اور ذخیروں کا صفایا کیا۔ ان کی جنگی پروازوں میں جو بات حیران کن تھی وہ یہ تھی کہ شمس اور شعیب نے شمس کی علالت کو صیغہ راز میں رکھا۔ ورنہ اسے فوراً پرواز کے ناقابل (GROUNDED) کر دیا جاتا۔ معجزہ تو یہ تھا کہ (جو دراصل شمس الدین کی ایمانی قوتوں کا کرشمہ تھا۔) جب وہ زمین پر ہوتا، اسے گردے کا شدید درد بے حال کر دیتا اور وہ اس جان لیوا روگ کو اپنے کمانڈنگ آفیسر سے چھپاتے چھپاتے پھرتا۔ لیکن وہ جونہی طیارے میں بیٹھ کر حملے کے لئے روانہ ہونے لگتا تو اس کا درد یوں رفع ہو جاتا جیسے وہ کبھی بیمار ہوا ہی نہیں تھا۔ اگر ڈاکٹر کسی بھی وقت شمس الدین احمد کا معائنہ کر بیٹھتا، تو وہ رپورٹ لکھ دیتا کہ یہ ہوا باز اور اس کا نیوی گیٹر ہر رات خودکشی کی کوشش کرتے ہیں اور معلوم نہیں کہ یہ ہوا باز اس جسمانی حالت میں طیارے کو کس طرح یکسوئی سے سنبھالتا ہے۔

صرف ایک رات یہ کرشمہ جل دے گیا۔ اس رات شمس اور شعیب اپنے بمبار بی۔۲۶ طیارے میں ہلواڑہ کے ہوائی اڈے پر بمباری کے لئے گئے۔ ان کا طیارہ ٹارگیٹ کے اوپر پہنچا تو نیچے سے طیارہ شکن توپوں اور مشین گنوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ شمس کے گردے سے درد کی ایسی ٹیس اٹھی جیسے کسی نے خنجر گھونپ دیا ہو۔ وہ آزمائش کا بھیانک لمحہ تھا۔ شمس تڑپ اٹھا ـــ درد کی اذیت سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ درد کس وقت اٹھا ـــ وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔ دشمن کے زمینی توپچی فضا کے انچ انچ پر آگ اُگل رہے تھے۔ طیارہ ان کی زد میں تھا۔ شمس کراہ رہا تھا۔ وہ کاک پٹ میں دہرا ہو گیا۔ اسے دشمن کے طیارہ شکن فائر کا ذرا برابر ڈر نہیں تھا۔ وہ ٹارگٹ پر بم گرانا چاہتا تھا۔ وہ اندھا دھند بم گرا کر بم ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ بم واپس لے آنا اسے گوارا تھا۔ آزمائش کی ایسی نازک گھڑی وہ خدائے ذوالجلال کے حضور گڑگڑانے لگا اور اس نے کلام پاک کی آیت ـــ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ ـــ کا ورد کرنا شروع کر دیا۔

مقدس آیت کا ورد کرتے ہوئے شمس الدین نے طیارے کو ہوائی اڈے کی طرف گھمایا اور بم گرانے کیلئے غوطے میں چلا گیا۔ دشمن کی گنوں نے پہلے سے زیادہ قیامت برپا کر دی لیکن پاکستان کا یہ شاہباز حشر کی اس فائرنگ میں خدائے بزرگ و برتر کے کلام کا ورد کرتے یکسوئی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ تو جیسے جلتے تنور میں جا رہا تھا ـــ

یارہ شکن توپوں کے جلنے کتنے ہی گولے بیک وقت اس کے طیارے کے قریب آکر پھٹے۔ طیارہ ایسا بُری طرح جھنجلایا یا جیسے شمس کے قابو سے نکل گیا ہو ـــــ شمس کا دو دیکبارگی ختم گیا۔

وہ آیت کا ورد کرتا رہا اور طیارے کو تارگیٹ کی سیدھ سے بھٹکنے نہ دیا۔ شمالی بھارت کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ں کے سامنے سانپ کی طرح بڑا ہوتا چلا گیا۔ زمینی توپچیوں کی نگاہیں اس کے طیارے پر تھیں۔ اور اب انہوں نے ریپڈ تیز) فائرنگ شروع کر دی۔ لیکن شمس کی نگاہ تارگیٹ پر تھی اور شعیب عالم اس کے پیچھے مکمل سکون سے بیٹھا خدا کو یاد کر رہا تھا۔ جب طیارہ بم گرانے کے مقام پر آیا تو شمس نے شعیب کو خبردار کیا اور نہایت اطمینان سے بٹن دبا یا۔ طیارہ شدید جھٹکے سے اوپر اٹھا ـــــ ایک ایک ہزار پونڈ کے آٹھ بم اس کے طیارے سے نکل کر دشمن کے وائی اڈے کی طرف گرنے لگے۔ فضا میں بموں کی چیخیں سنائی دیں اور یہ قہر آلود چیخیں بھارتیوں کو لرزہ براندام کر کے یہ دھماکہ بن گئیں جس سے بھارت کا خطہ میلوں دُور تک کانپ اٹھا ـــــ ان میں سے ایک بم پٹرول کے بہت بڑے خیرے میں جا پھٹا۔ ایسا شعلہ اُٹھا جو شب کی تیرگی میں ساٹھ میل دُور سے بھی نظر آتا تھا۔ شعلہ اُوپر ہی اوپر اٹھنے لگا اور سیلہ کالا دھواں بھارت پر چھانے لگا۔

دشمن کے ایک تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک کر شمس نے شعیب کو بتایا کہ وہ بم گرا چکا ہے۔ شعیب نے سے واپسی کے راستے کا صحیح تعین کر دیا۔ حملہ کامیابی سے مکمل ہو گیا اور شمس پر فرض کا جو بوجھ تھا وہ اُتر گیا تو گردے اور درد لوٹ آیا۔ طیارے کو سنبھالنا تو درکنار شمس کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا ناممکن نظر آنے لگا۔ لیکن اس نے طیارے و صحیح سلامت اڈے پر اُتار لیا۔

اس کا نیوی گیٹر سکواڈرن لیڈر شعیب عالم کہتا ہے ـــــ "شمس طیارے تک درد سے کراہتا ہوا آیا رتا تھا لیکن طیارے پر بیٹھتے ہی وہ یکسر بدل جاتا تھا۔ درد کا احساس ہی مٹ جاتا تھا۔ وہ نہایت اطمینان اور ٹھنڈے ل سے پرواز کرتا تھا۔ اور نیچی پرواز سے دشمن کے ٹھکانوں اور ذخیروں پر صحیح نشانوں پر بم گراتا تھا۔ تمام حملوں میں ں نے ایک بار بھی غلط جگہ پر بم نہیں گرائے۔

فائر بندی کے دوسرے روز شمس الدین ہسپتال میں داخل ہوا۔ اس کا اپریشن کیا گیا تو اس کے گردے میں سے ٹھائیس (۲۸) پتھریاں نکلیں۔ ان اٹھائیس پتھریوں کی اذیت کو وہ مسلسل سترہ روز اور سترہ راتیں کسی کو بتائے بغیر برداشت رتا رہا۔ وہ اب شاید اڑ نہ سکے گا لیکن مطمئن ہے کہ اس نے ملک و ملت سے جو عہد کیا تھا اُسے پورا کر دیا ہے۔

(ماخوذ از "پاک فضائیہ کے شاہین" ـــــ عنایت اللہ)

گمنام شہید

ایک لانس نائک سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے محاذ کے متعلق پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی بات سنائے گا۔ لیکن وہ بولا "میں تو لڑا اور زندہ رہا۔ لیکن بات میں اس سپاہی کی سناؤں گا جو لڑا اور شہید ہو گیا ....." اس نے آہ لی اور چپ ہو گیا۔ سسکی سی لے کے کہنے لگا "لیکن دُکھ جو مجھے کھا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ مجھے بچانے کی خاطر جان پر کھیل گیا ..... اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون تھا، اس کا نام کیا تھا، اور کہاں کا رہنے والا تھا؟ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سی پلٹن کا جوان تھا ....." لانس نائک کے آنسو نکل آئے۔

یہ لانس نائک ٹینک رجمنٹ کا عہدیدار ہے۔ جنگ کا تیسرا روز تھا۔ اور اس محاذ پر دو محاذ کا نام مصلحتاً نہیں لکھا جا رہا ہے، معرکہ گھمسان کا تھا، دشمن کی نفری بے پناہ تھی۔ اس کی سپاہ جم کے لڑ رہی تھی اور پاکستان کے چند ایک ٹینک سوار اور انفنٹری کے جانباز دشمن کے پاؤں اکھاڑنے کی قسم کھائے ہوئے تھے۔ گولہ باری کا یہ عالم کہ چند فٹ دور اپنا ساتھی نظر نہ آتا تھا۔ اپنے کمانڈروں کا یہ جذبہ کہ انہوں نے بھاگے نہیں بلکہ بڑھ کے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جنگی نقطۂ نگاہ سے یہ فیصلہ کہاں تک سودمند تھا؟ ۔ کمانڈروں نے تو جان کی بازی لگا رکھی تھی ـــــ ٹینکوں نے "چارج" کر دیا۔ اپنے توپ خانے کے او۔ پی نے فوراً نیا فائر آرڈر دے کر "کورنگ" گولہ باری کا رینج بڑھا دیا تاکہ اپنے ٹینک زد میں نہ آ جائیں۔

دشمن کا دفاع مضبوط تھا۔ اس نے خوب مقابلہ کیا اور ادھر صورتِ حال یہ ہو گئی کہ اپنے ٹینک اور انفنٹری کے جوان اپنی اپنی جنگ پر اُتر آئے۔ کمپنیاں اور پلاٹونیں گڈمڈ ہو گئیں۔ لیکن یہ عالم نفسا نفسی کا نہیں بلکہ فرداً فرداً معرکے کا تھا اس لانس نائک کا ٹینک ہٹ ہو گیا۔ ٹینک کی بڑی توپ ٹھیک رہی اور وہ بے کار ٹینک سے توپ فائر کرتا رہا۔ پھر ایک اور گولہ توپ کو بھی بے کار کر گیا۔ کریو محفوظ رہے۔ انہیں پیچھے آ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ کسی اور ٹینک کی تلاش میں کسی زخمی کریو کی جگہ لینے کو بھاگنے دوڑنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد معرکے کی صورت ایسی ہو گئی کہ انہیں دشمن کے مورچے اور بنکر بہت قریب نظر آنے لگے۔ اس لانس نائک کو ایک لائٹ مشین گن پڑی نظر آ گئی۔ یہ انفنٹری کی گن تھی۔ گنر شدید زخمی تھا۔ لانس نائک اسی گن کے پیچھے لیٹ گیا۔ اور فائر کرنے لگا۔ دشمن اس قدر قریب تھا کہ ہاتھ سے پھینکا ہوا گرنیڈ بھی تارگیٹ تک پہنچ جاتا تھا۔ اب انفنٹری آگے تھی اور ٹینک "سپورٹ" کر رہے تھے۔ اتنے میں دشمن نے گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔

لانس نائک سناتا ہے ـــ "میرے چاروں طرف گرنیڈ پھٹ رہے تھے۔ ذرا گرد اور دھواں چھٹتا تھا تو میں ایک دو برسٹ (بوچھاڑ) فائر کر دیتا تھا۔ اتنے میں کسی پلٹن کا ایک سپاہی بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے پاس رائفل تھی۔

اُس نے میرے قریب پوزیشن لے لی۔ ہم مورچے میں نہیں، ایک کھیت کی مینڈھ کے پیچھے لیٹے فائر کر رہے تھے۔ اس سپاہی نے مجھے کہا۔ "گرائیں! گرنیڈ بہت آ رہے ہیں۔ اگر میں مر گیا تو کوئی بات نہیں، صرف ایک رائفل کا نقصان ہوگا۔ مگر تم مر گئے تو مشین گن چپ ہو جائیگی۔ یہاں رائفل کی نہیں مشین گن کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہمارے قریب جو گرنیڈ گرا اُسے میں لے لوں گا!"

لانس نائک کہتا ہے کہ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ گرنیڈ اگر دور سے آئے تو گرتے ہی پھٹ جاتا ہے اور اگر قریب سے آئے تو اس میں گرنے کے بعد بھی ایک آدھ سیکنڈ کا وقفہ ہوتا ہے۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ جو گرنیڈ ہمارے قریب گرا اسے میں لے لوں گا، اس کا مطلب کیا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے سختی سے منع کیا کہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ لیکن اسی لمحے ہمارے قریب ہی دھمک کی آواز آئی۔ ایک گرنیڈ آ گرا تھا۔ اس سپاہی نے دیکھ لیا۔ گرنیڈ بمشکل ایک گز دور میری گن کے سامنے گرا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ چہرے پر رکھ لئے، صرف اس لئے کہ مر جاؤں تو چہرہ تو محفوظ رہے گا۔ کوئی پہچان تو سکے۔ صرف ایک سانس کی دیر تھی۔ گرنیڈ اٹھ کر بھاگنے کی مہلت نہیں دیا کرتا۔ لیکن میرے اجنبی ساتھی نے اس ایک سانس کے عرصے میں لیٹے لیٹے جانے کس طرح آگے کو چھلانگ لگائی اور گرنیڈ کے اوپر جا گرا، اُدھر وہ گرنیڈ پر گرا، ادھر گرنیڈ پھٹا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس جانباز کے جسم کا کیا حال ہوا ہوگا۔ لیکن اس نے مجھے بھی اور میری مشین گن کو بھی بچا لیا تھا۔

لانس نائک کے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر وہ سسکیاں لینے لگا۔ پھر دیر بعد بولا۔ "وہ تو شہید ہو گیا لیکن مجھے پاگل کر گیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور مشین گن کی میگزین اٹھا کر گن کو لہے سے لگا لی۔ دشمن کے پاؤں اکھڑ رہے تھے ہمارا چارج کام کر گیا۔ میں آخر تک گن کو لہے سے فائر کرتا رہا اور بہت آگے نکل گیا۔ لیکن میں زندہ رہا .... یہ دُکھ مجھے بے حال کئے رکھتا ہے کہ وہ شہید ہو گیا تو میں کیوں زندہ ہوں؟ وہ میرے لئے شہید ہو گیا تھا۔ اگر اس کے گھر یا گاؤں کا پتہ چل جاتا، تو اس کی ماں کے قدموں پر جا سر رکھتا۔ لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون تھا" ...... اور لانس نائک زار و قطار روتا رہا۔

(عنایت اللہ ــ سیارہ ڈائجسٹ)

فلکِ پاکستان کے درخشندہ ستارو!

یہ تمہارے عزم و ایثار کا صدقہ ہے کہ مملکتِ پاکستان اس وقت قائم اور ملتِ پاکستانیہ اس وقت زندہ ہے۔ تمہاری عظمتِ کردار کے سامنے ہم سب کے سر جھکتے ہیں۔

عَلَیْکُمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ رَحْمَۃٌ

خورشید عالم

افریقہ۔ایشیا کا عالمی کردار

اقبالؒ کے الفاظ میں حیات نازک سے نازک مرحلے میں بھی اپنا راستہ وجدانی طور پر خودبخود درست کر لیتی ہے۔ مشیت کو دراصل اپنے راستے تراشنے نہیں پڑتے۔ وہ تو ازل سے واضح اور روشن ہیں۔ وہ نازک مراحل سے اس وقت دوچار ہوتی ہے جب انسان اس کے دوش بدوش چلنے کی بجائے اس کے روبرو ہو کر اس کا راستہ روک لینے پر مصر ہوتا ہے۔ ایک ایسا ہی نازک مرحلہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد آیا۔ اس رستاخیز نے یورپ کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ یورپ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کا آشیاں جس شاخ پر قائم تھا، وہ بعض طوفانوں میں اپنی خوبی اور قوت کی بنا پر نہیں، بلکہ یورپ کی مشینوں کے بل بوتے پر سلامت رہ سکی تھی۔ دوسری جنگ میں یہ مشینیں اس بُری طرح سے آپس میں ٹکرائی تھیں کہ نہ شاخ کی کسی کو فکر رہی تھی اور نہ آشیانے کا ہوش رہا تھا۔ یہ قیامت گزر جانے کے باوجود یورپ کی بساط تہہ نہ ہوئی۔ بات تہذیب و تمدن کی ہوتی تو زمانے کو یورپ کے عروج کا روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ بات اس سے مختلف بلکہ برعکس تھی۔ یورپ کی بالادستی کا دارومدار مشینوں پر تھا۔ اور دوسری جنگ نے ان کو خوفناک ترین بنا دیا تھا۔ امریکہ نودریافت ایٹمی تباہ کار قوت کا واحد مالک بن گیا تھا۔ وہ اس قوت کو جاپان جیسے حریف کے خلاف بڑی دیدہ دلیری سے استعمال کر کے میدان بھی مار چکا تھا۔ کوئی عالمی طاقت اس کی ٹکر کی نہیں رہ گئی تھی۔ جنگ نے سبھی کو پیس کے رکھ دیا تھا۔ ایک امریکہ ایٹم بم اٹھائے دندناتا پھر رہا تھا، اور دنیا ساری خوف سے سہم گئی تھی۔ اور تاریخ کی لمبی اور اندھیری سرنگ میں کھو جانے کے قریب پہنچ گئی تھی۔

کاروانِ انسانیت امریکی ایٹم بم کے گہرے سائے میں بھٹکنے لگا تھا کہ مشیت نے حیران کن سرعت سے اسے ایک قطار میں کر دیا اور سرنگ کے دہانے پہ سے اُس کا راستہ بدل دیا۔ ۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمے پر یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اب کوئی خوبرو جوان امریکہ جیسے پہلوان کے منہ آئے گا۔ لیکن ۱۹۴۹ء میں چین کے پیر دیرینہ سال

نے امریکہ کو ایسی چٹنی دی کہ ایٹم کی عالم آشوب اور انسانیت سوز قوت جبینِ فرنگ پر شکن بن کے رہ گئی۔ اس شکن کا ایک وقت گزرنے کے ساتھ کم نہیں ہوا بلکہ اور گہرا ہوا ہے۔ مشیت کی اس ستم ظریفی سے امریکہ پر کیا گزری، اس کا اندازہ اس کے کردار سے صاف صاف لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا ردِ عمل دو گونہ ہے۔ ایک طرف تو وہ ایسے تباہ کن آلات کے انبار پہ انبار لگاتا چلا جا رہا ہے جن کا خمیر تو ایٹمی تباہ کاری سے اٹھایا گیا، لیکن جن کے سامنے ایٹم بم کھلونا دکھائی دیتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ اس شکست پر پیچ و تاب کھا رہا ہے، جو اسے چین کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ قوت کے نشے نے اس کے سر میں "انا و لاغیری" کا خناس بھر دیا ہے اور احساسِ شکست نے اسے انتقام کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ اب اسے کسی پہلو چین نہیں۔ اس کی داخلی دنیا میں عظیم خلفشار ہے۔ اور ایسا ہی خلفشار اس نے خارج میں قدم قدم پر برپا کر رکھا ہے۔ امریکہ سے مختلف اور انسانی کردار کی توقع رکھنا اپنے آپ کو دھوکا دینا اور تاریخ کا منہ چڑانا ہے۔

امریکہ کی اس ذہنیت اور کردار نے غیر یورپی دنیا کے لئے عجیب صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، دو عالمگیر جنگوں کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے ایشیا میں اور پھر افریقہ میں سیاسی آزادی کا دور دورہ ہو گیا۔ آزادی کی اس رو میں پاکستان اور چین کی آزادی نے ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا۔ ان کی آزادی دو علاقوں کی نہیں، دو تصورات کی آزادی اور کارفرمائی ہے۔ اور دونوں اصلاً یورپی ذہنیت کے نقیض ہیں۔ چنانچہ ایشیا اور افریقہ کے آزاد ممالک ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اور قریب ہو ہو کر مل بیٹھنے لگے۔ ایک خاصا ہمہ گیر اجتماع ۱۹۵۵ء میں انڈونیشیا کے مقام بندونگ پر ہوا۔ امریکہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ شاید اسے اس نے روکنا بھی نہیں چاہا۔ اس کا گمان تھا کہ اس بے ہنگم سے اجتماع میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جائیں گی۔ اور سب اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں گے۔ نہ کوئی دو ٹوک بات ہو گی اور نہ کوئی حتمی فیصلے ہوں گے۔ لہٰذا، مداری کا یہ تماشہ بھی ہو جانے دیا جائے۔ یہ تماشہ ہوا لیکن بندونگ کا مداری تماشہ دکھا کر جانے لگا تو امریکہ نے دیکھا کہ دامِ ہوائے یورپ کے حلقے ٹوٹ رہے ہیں۔ اور کوئی دم جاتا ہے کہ یورپ کے پرزے اڑنے لگیں گے۔ امریکی دیوالے کے لئے اس تصور نے ہُو کا کام کیا۔ اور وہ افریشیائی تعاون و تعامل میں رخنے ڈالنے کے درپے ہو گیا۔

جیسے امریکہ نے دیکھا کہ بندونگ کے اجتماع نے چین کے راستے کے وہ کانٹے کافی حد تک صاف کر دیئے ہیں جو امریکہ بکھیرتا چلا آیا ہے۔ اسی طرح بھارت نے بھی دیکھا کہ چین کا راستہ صاف ہونے سے اس کا اپنا راستہ پُرخار ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا راستہ صاف کر کے افریشیائی برادری تک پہنچنے اور اس میں اپنی جگہ حاصل کرنے کی تو کوئی فکر نہیں کی، البتہ امریکہ کی نوکری کے کانٹے اس نے اپنی جھولی میں بھر لئے۔ اور افریقہ اور ایشیا کے اتحاد و اشتراک کی راہ میں بکھیرنے لگ گیا۔ شاید پاکستان کے علاوہ کوئی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بھارت یوں امریکہ کا

مزارع بن جاتے گا۔ لیکن بھارت نے بالکل کسی قسم کا شبہ نہیں رہنے دیا کہ وہ کس کے اشارے پر یا کس کی خاطر کیا کر رہا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں تو اس نے حد کر دی۔ بجائے اس کے کہ وہ گفت و شنید سے چینی بھارتی سرحد کا تعین کراتا، اس نے چین پر حملہ بول دیا۔ بھارت نہ چین کا مدِمقابل تھا اور نہ اسے اس جارحانہ اقدام سے اصل مسئلہ کا تصفیہ مقصود تھا، وہ دراصل اس طریق سے چین اور افریشیائی برادری کے درمیان حائل ہوگیا۔ دونوں کو پوری طرح جدا کر دینے کے لئے وہ چین کی دہائی دے کر امریکہ کو اپنے ہاں بلا لایا۔ بھارت نے اپنے آپ کو اس حد تک چین کا مخالف بنا لیا کہ دونوں کا کسی مشترکہ اجتماع میں شریک ہونا خارج از بحث دکھائی دینے لگا۔ یہ فضا پیدا کر کے اس نے دوسری بندونگ کانفرنس کو ناممکن نہیں تو خاصا دشوار بنا دیا۔ امریکہ یہی چاہتا تھا اور اس کی یہ خواہش پوری کرنے میں بھارت کی برہمنی ذہنیت نے ضمیر کی ہلکی سی بھی خلش محسوس نہ کی۔ افریشیائی اجتماع کے امکانات ختم کرنے کے لئے بھارت غیر جانبدار ممالک کے اجتماع پر زور دیتا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نام نہاد غیر جانبداروں میں چین شریک نہیں ہوسکے گا۔ پاکستان سے اپنی روایتی دشمنی صحیح ثابت کرنے کے لئے بھارت نے ایک ہی سانس میں چین اور پاکستان کا ذکر کرنا شروع کر دیا۔ افریشیائی برادری میں مزید رخنہ ڈالنے کے لئے بھی ضروری تھا کہ چین اور پاکستان میں غلط فہمی نہ پیدا کی جاسکے تو دونوں کے مل بیٹھنے کو دنیا کی نظروں میں قابلِ اعتراض بنایا جاسکے۔ پاکستان کو غلط رنگ میں پیش کرنے کا بھارت کو مزید یہ فائدہ پہنچتا تھا کہ وہ پاکستان اور مصر میں غلط فہمی کی فضا پیدا کر کے مسلمان ممالک کا آپس میں مل بیٹھنا دشوار تر کر سکتا تھا۔ گویا بھارت نے افریشیائی برادری میں پھوٹ ڈالنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

بھارت کے اس کردار سے امریکہ کے قدم پھر سے ایشیا میں جمنے لگے حالانکہ وہ کوریا میں پوری طرح قدم جمانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ بھارت جیسا حاشیہ بگوش میسر آجانے پر امریکہ کو ویٹ نام میں شہ ملی اور وہ پوری طرح اسے اپنی جنگ سمجھ کر افواج اور ساز و سامان کا ہجوم کرنے لگا۔ اس شہ پر اسے ایشیا اور افریقہ کے مشترکہ سمندر میں اپنا بیڑہ لے آنے کی بھی ہمت ہوگئی۔ امریکہ کا دیو استعمار جس پاگل پن سے ویٹ نام میں پلنے کو سیدھا، اسے دیکھ کر چین اور پاکستان کے علاوہ شاید ہی کسی افریشیائی ملک کو بھانپنے یا سمجھ لینے کے بعد برملا کہنے کی توفیق نصیب ہوئی ہو کہ ایشیا کا سب سے بڑا غیر جانبداری کا دعوے دار دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت کا حاشیہ بردار اور نقیب بن گیا ہے۔ لیکن یہ عام طور پر محسوس کیا جانے لگا کہ ایشیا اور افریقہ کی اقوام کو مل بیٹھ کر صورت حال کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ اس طرح دوسری بندونگ کانفرنس کے انعقاد کا سوال ایک عملی مسئلہ بن کر سامنے آگیا۔ ۱۹۶۵ء میں ایسی مؤتمر کا فیصلہ تو کیا گیا تھا، لیکن اس کے انعقاد کے لئے مقام یا وقت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ غالباً اُس وقت وثوق سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آئندہ ایسا اجتماع ضروری ہوگا۔ اور اس سے خاطر خواہ نتائج نکل سکیں گے۔ بھارت ایسی کانفرنس کے حق میں نہیں تھا۔ کیونکہ اسے چین اور پاکستان دونوں کا سامنا کرنے کا ڈر تھا۔

اس نے حیلوں بہانوں سے مجوزہ اجتماع کو ٹالنا چاہا۔ لیکن عمومی تقاضا اتنا شدید ہو چکا تھا کہ وہ کامیاب نہ ہو سکا بالآخر طے پایا کہ اجتماع الجزائر میں ہو۔ اس کے لئے مناسب انتظامات طے پانے لگے۔ اور شریک ممالک کے وزرائے خارجہ الجزائر میں جمع ہونے لگے۔ کانفرنس بالکل یقینی دکھائی دے رہی تھی۔ معاملہ بھارت کے بس کا نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے انعقاد کو روکنے اور ٹلانے میں ناکام ہو چکا تھا۔ لیکن امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ کانفرنس منعقد ہو۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۲ء تک بین الاقوامی سیاست میں بڑی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ بھارت کی بدنامی کے واضح آثار پیدا ہو چکے تھے۔ چین ایشیا ہی میں نہیں، افریقہ میں بھی اپنا اثر و وقار پیدا کر چکا تھا۔ وہ امریکہ کی دشمنی کے علی الرغم اور روس کی امداد بند ہو جانے کے باوجود ایٹمی قوت بن چکا تھا اور چھوٹی غیر یورپی طاقتیں اس سے امیدیں وابستہ کرنے لگ گئی تھیں۔ ویٹ نام میں امریکی کردار سے بڑی دل برداشتگی پائی جاتی تھی۔ انڈونیشیا اقوام متحدہ سے علیحدہ ہو چکا اور ایک نئے عالمی ادارے کے منصوبے بننے لگے تھے۔ پاکستان، ایران اور ترکی جیسے وابستگان مغرب واضح طور پر غیر جانبدار بنتے جا رہے تھے۔ ایسے ماحول میں ایشیائی افریقی اجتماع دور رس نتائج پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا تھا۔ یہ توقع پیدا ہو چلی تھی کہ غیر یورپی دنیا اپنی محفل علیحدہ سجانے کی طرح ڈال سکے گی۔

امریکہ ایسے اجتماع کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ اونچی سطح سے تار ہلائے گئے اور دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ الجزائر کی حکومت کا تختہ بیٹھے بٹھائے راتوں رات اُلٹ گیا۔ اجتماع گاہ کو بم تک سے اڑا دینے کی کوشش ہوئی۔ نئی حکومت نے بہت کوشش کی کہ اجتماع ہو جائے لیکن جو فضا پیدا ہو چکی تھی اس میں اس پر اتفاق ناممکن ہو گیا۔ نضا یہاں تک خلاف اجتماع ہو گئی کہ اس پر بھی اتفاق نہ ہو سکا کہ اجتماع وقتی طور پر ملتوی کر دیا گیا ہے اور حالات سازگار ہونے پر از سرِ نو منعقد کیا جائے گا۔ الجزائر کا انقلاب کیسے برپا ہوا؟ اس کا جواب کچھ بھی کیوں نہ دیا جائے، اس کا نتیجہ امریکہ کے حق میں نکلا اور دوسری بندونگ کانفرنس منعقد ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس سے عالمی سیاست میں ایک خطرناک طرح پڑ گئی۔ اور امریکہ بڑی سرگرمی سے اس کوشش میں مصروف ہو گیا کہ چین کے مراسم مشرقی اقوام سے استوار نہ رہ سکیں۔ امریکہ کی مثال ہنومان کی سی ہو گئی ہے جس کی دم کو آگ لگی ہے اور وہ اس جلتی دم سے ملکوں ملکوں کو نذرِ آتش کئے چلا جا رہا ہے۔

الجزائر کے انقلاب قیادت سے دوسری بندونگ کانفرنس کا انعقاد ناممکن ہو گیا تو ایک سال بعد ایک خونریز اقدام کیا گیا تاکہ آئندہ اس انعقاد کا خیال آسانی سے نہ آ سکے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت نے پاکستان پر چڑھائی کر دی۔ یہ نتیجہ تھا اس فسادِ فکر و عمل کا جس کا مظاہرہ بھارت مسلسل کرتا چلا آیا تھا۔ تین سال پہلے بھارت نے چین پر لشکر کشی کی تھی تو اس کے مغربی سرپرستوں پر اچھی طرح واضح ہو گیا تھا کہ جب تک آزاد پاکستان موجود ہے امریکہ کی خلاف چین حکمتِ عملی کو بھارت پوری ڈھٹائی اور کامیابی سے روبہ عمل نہیں لا سکتا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنا

مشکل نہ تھا کہ اس سنگِ گراں کو راستے سے ہٹایا جائے۔ بھارت جیسے بڑے ملک کے لئے پاکستان کو راہِ راست پر لے آنا بائیں ہاتھ کا کھیل نظر آتا تھا۔ بھارت کو بھی گھمنڈ تھا کہ وہ پاکستان پر غلبہ حاصل کرلے گا اور امریکہ کو بھی بھروسہ تھا کہ پاکستان جیسا ملک زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے گا۔ بھارت بڑے طمطراق سے نکلا۔ لاہور میں جشنِ فتح منانے کا اوقات نامہ اس نے پہلے سے طے کرلیا تھا۔ بھارت کو یقین تھا کہ پاکستان پر قبضہ ہوگیا تو چین کے خلاف سارے کا سارا محاذ اس کے اپنے تصرف میں ہوگا۔ اور پھر وہ امریکہ سے اپنی گندم نمائی اور جو فروشی کا پورا پورا انعام حاصل کرلے گا۔ نیز یہ عالمِ اسلامی کے اتحاد پر بھی کاری ضرب ہوگی اور افریشیائی اتحاد پر بھی۔ پاکستان کے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا ہی' ایشیا اور افریقہ کے خلاف بھی یہ بہت بڑی سازش تھی۔ امریکہ کی حیثیت عامل کی تھی اور بھارت کی معمول کی۔ یہ پاکستان کا کمال تھا کہ اس نے اس عالمی سازش کو ناکام بنا دیا۔ پاکستان کے مجاہدانہ کردار نے غیر یورپی دنیا کے لئے امید کے نئے افق روشن کر دیئے اور اس کے جذبۂ خود اعتمادی کو اس سے تقویت پہنچی کہ بہت بلند سے چھوٹی طاقتیں بڑی طاقتوں کے عزائمِ ناپاک کو خاک میں ملا سکنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

بھارت پاکستان کو واحد دشمن تو پہلے دن سے ہی سمجھتا چلا آرہا تھا لیکن ستمبر ۶۵ء کی عریاں جارحیت کے بعد اس کے عزائمِ مذمومہ میں کسی قسم کا شبہ نہ رہ گیا۔ اس سے یہ بات بھی پکی ہوگئی کہ بھارت کے رویئے میں بنیادی تبدیلی کے بغیر بھارت اور پاکستان میں ہمسایانہ روابط پیدا نہیں ہوسکتے۔ بھارت نے دشمنی کی ایسی ہی فضا چین سے پہلے سے پیدا کر رکھی تھی۔ چین اور پاکستان جیسے ہمسایوں سے دشمنی کی یوں طرح ڈال کے بھارت نے افریشیائی اتحاد کو سرابی حیثیت بخش دی۔ اس پس منظر میں امریکہ کو اور کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے دیکھا کہ بھارتی جارحیت کے دوران اس کے کردار کے پیشِ نظر پاکستان اقوامِ متحدہ سے نکل آنے کی باتیں کرنے لگا تھا۔ اقوامِ متحدہ سے متعلق پاکستان کا یہ ردِعمل کس قدر صحیح تھا، اس کو بعد کے واقعات نے پوری طرح ثابت کر دیا۔ اگر ۱۹۶۵ء میں پاکستان عالمی ادارے سے علیحدہ ہوجاتا تو یہ ادارہ زمین بوس ہو کے رہ جاتا۔ چین، انڈونیشیا اور پاکستان کے باہر آجانے کا مطلب یہ ہوتا کہ ۹۰ کروڑ آبادی کے ممالک نے اقوامِ متحدہ کی رکنیت کو حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔ یقین تھا کہ ان کے تتبع میں کئی اور ممالک اس ادارے کو خیرباد کہہ دیتے اور اس طرح ایک ایسا نیا عالمی ادارہ معرضِ وجود میں آجاتا جو امریکہ کے استعماری اثر سے یکسر آزاد ہوتا۔ امریکی استعماریت کو عالمی سطح پر اس اقدام سے صحیح معنوں میں ایسا صدمہ پہنچتا کہ اس سے جاں بر ہونا اس کے لئے آسان نہ ہوتا۔

پاکستان سے اقوامِ متحدہ نے پوری پوری ناانصافی کی پھر بھی پاکستان اس سے علیحدہ نہ ہوسکا۔ پاکستان سے متعلق یوں اطمینان ہوگیا تو امریکہ کی توجہ انڈونیشیا پر مبذول ہوگئی۔ انڈونیشیا اور چین میں فضا تھے دوستی کو آہستہ آہستہ مکدر کیا گیا۔ صدر سوئیکارنو کے خلاف بغاوت کرائی گئی اور ان عناصر کو آگے بڑھایا گیا جو چین سے

ناخوش تھے۔ چینیوں کے خلاف ہنگامے کرائے گئے۔ اور ایک طوفانِ بدتمیزی برپا کرا دیا گیا۔ دونوں ملکوں میں کشیدگی پیدا کرا کے ان کے سیاسی اور سفارتی تعلقات خراب کئے گئے۔ اب دونوں ایک دوسرے کے دوست نہیں ہیں اور انڈونیشیا پھر سے اقوامِ متحدہ کا رکن بن گیا ہے۔ الجزائر کے انقلاب اور پاکستان پر بھارتی حملے کے بعد، یہ تیسرا خون ریز اقدام ہے جس کا مطلب افریشیائی ممالک کے مابین بدمزگی پیدا کرنے اور انہیں ایک دوسرے سے دور رکھنا ہے۔ انڈونیشیا میں جونہی انقلاب قیادت آیا، بھارتی مہرہ آگے بڑھایا گیا اور بھارت اور انڈونیشیا میں دوستی اور تعاون کی باتیں ہونے لگیں۔ یہ باتیں افریشیائی برادری میں تشتت و افتراق کا بیج بونے کے مترادف ہیں اور امریکہ کا مزارع بھارت ہر وقت اس کلبہ رانی کے لئے تیار ہوتا ہے۔

بات یہیں تک محدود نہیں رہنے دی جا رہی۔ درحقیقت یہ واقعات نہ انفرادی ہیں نہ استثنائی، یہ ایک سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ انڈونیشیا کو چین سے علیحدہ کر لینے کے بعد برما اور نیپال میں حال ہی میں ہنگامے کرائے گئے اور ان ممالک سے چین کے تعلقات کو مکدر کیا گیا۔ قیاس یہی ہے کہ سازش کی ان اینٹوں سے ایک نئی دیوارِ چین تعمیر کی جا رہی ہے۔ اس کا معمار امریکہ ہے اور "مزدور" بھارت۔ اس طرح بھارت ان عوامل کا رضا کارانہ مرکز بنتا جا رہا ہے جو غیر یورپی دنیا میں یورپ کے ہاتھوں کارفرما ہیں، اور جن کا مقصد یورپ کے استیلاء و غلبہ کو نئے رنگ میں مسلط کرنا اور استحکام بخشنا ہے۔ شاید بھارت بالآخر وہ میدانِ کارزار بنے گا جہاں یورپ کے خلاف فیصلہ کن معرکہ لڑا جائے گا۔ لیکن ایک وقت تک یہ معرکے اپنے اپنے رنگ میں دو اور مقامات پر گرم رہیں گے۔ ایک مقام ویت نام ہے اور دوسرا فلسطین۔ دونوں جگہ یورپ کی استعماری ذہنیت کمال عریانی سے مصروفِ کار ہے ویت نام اور فلسطین یورپ کے تابوت کی کیلیں ہیں۔ آخری کیل نہ بھی ہوتے تو، انشاء اللہ، تابوت کو اس حد تک مضبوط ضرور کر دیں گے کہ آخری کیل جڑے جانے تک اس کے کھل جانے کا خطرہ نہ رہے۔

منشورِ آزادی

آزادی، دنیا کی ہر قوم کے نزدیک زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ اس کے لئے ہر قربانی کو کم قیمت سمجھا جاتا ہے لیکن آزادی کسے کہتے ہیں؟ اس کا صحیح مفہوم ——— کسی کے ذہن میں نہیں!

انسان کو صحیح آزادی صرف قرآنِ کریم عطا کرتا ہے

یہ کس طرح ——— اسے پرویز صاحب کے اس خطاب میں ملاحظہ فرمایئے جسے نہایت حسین انداز میں آفسٹ پر طبع کرایا گیا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ (علاوہ محصول ڈاک)۔ ——— خود پڑھئے اور احباب کو تحفتہً پیش کیجئے!

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ لاہور

طلوعِ اسلام

کی

موجودہ اشاعت بحمداللہ کافی بڑھ چکی ہے!

اور جس رفتار سے یہ ملک میں مقبول ہو رہا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کتنی تیزی سے اور بڑھے گی۔ نیز اس کا ایک ایک پرچہ کئی کئی لوگ پڑھتے ہیں اور اس کا مطالعہ پاکستان اور بیرونی ممالک کے نہایت بلند پایہ طبقہ میں ہوتا ہے ——— اس سے

آپ اندازہ لگائیے کہ

طلوعِ اسلام میں اشتہار دینے سے

آپ کے کاروبار کو کس قدر پبلسٹی مل سکتی ہے!

اشتہارات کے نرخ حسب ذیل ہیں

ٹائیٹل	ایک بار	سال بھر کا ٹھیکہ
صفحہ نمبر ۲، ۳	۱۷۵ روپے	۱۵۰ روپے (فی اشاعت)
صفحہ نمبر ۴	۲۰۰ روپے	۱۷۵ " (" ")
اندرونی صفحات		
پورا صفحہ	۱۲۰ روپے	۱۰۰ روپے (" ")
نصف صفحہ	۷۰ روپے	۶۰ روپے (" ")

اُجرت اشتہار مسودہ کے ساتھ پیشگی آنی چاہیئے۔ اگر کسی اشتہار کا بلاک بنوانا مقصود ہو تو بلاک کی اُجرت الگ لی جائے گی۔ غیر مہذب اشتہار شائع نہیں کئے جائیں گے۔

ناظم
ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری انہیں نئے انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد، چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دل کش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیبی ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔
جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دل کش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت، بارہ روپے

نظامِ ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برقِ طور — صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔ جو یوں کہیے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام / ضحی الاسلام — مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکہ آرا تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

طلوعِ اسلام کی حیات افروز پیشکش

جہاد کیا ہے ——— ؟
جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے؟
مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ ہیں ——— قرآن کی رُو سے قوانین جنگ کیا ہیں ——— اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب۔
ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔
بصیرت افروز۔ حیات آموز۔
قیمت صرف ——— دو روپے فی جلد

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور

A NEW QUALITY IN SHIRTING FABRICS

Chaudhry

SUPERIOR WHITE SHIRTING

- PRICE WITHIN REACH OF EVERYBODY
- QUALITY CLOTH WOVEN WITH DURABLE YARN
- AVAILABLE EVERYWHERE

HABIB TEXTILE MILLS LTD. KARACHI.

Sole Distributors for Pakistan
M/S. AMOD MOTI & CO.
Salah Mohd. Street, Karachi.